BIHAR URDU ACADEMY

دسمبر ۲۰۲۳ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

نعتیہ غزل

قتیلؔ داناپوری

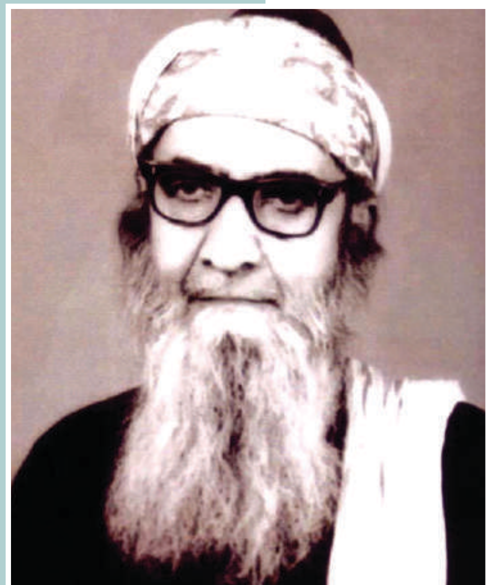

محمد مصطفیٰ تم ہو ، حبیب کبریا تم ہو
جو بالا فہم انساں سے ہو ، وہ نام خدا تم ہو

لباسِ عنصری میں مظہر شان خدا تم ہو
قسم اللہ کی ، آئینۂ وحدت نما تم ہو

تمہیں سے بزم ہستی ہے، تمہیں تک بزم ہستی ہے
ہماری ابتدا تم ہو ، ہماری انتہا تم ہو

اک اک کو یاد ہے اب تک وہ میثاقِ ازل شاہا
کہ سب ہیں مقتدی ہی مقتدی اک مقتدیٰ تم ہو

مہہ و خورشید ہے خاکِ کفِ پا کا اک اک ذرّہ
کہ اے نور مجسم ، مظہر نور خدا تم ہو

نوید حضرت عیسیٰ ، ندائے موسیٰ و یحییٰ
مرے مولا خلیل حضرتِ حق کی دعا تم ہو

قتیلؔ بے سر و ساماں پہ بھی چشم کرم شاہا
غریبوں کے سہارا ، بیکسوں کے آسرا تم ہو

حضرت قتیلؔ داناپوری ایک معزز اور ذی علم صوفی و سادات خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا پورا نام سید شاہ محمد قائم رضوی اور والد کا نام سید شاہ محمد حسین قادری ہے۔ وہ اپنے آبائی مکان شاہ ٹولی داناپور میں ۷ردسمبر ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے۔ داناپور کی جامع مسجد اور وہاں کے مدرسہ حشمت دادخاں میں ابتدائی تعلیم کے بعد بلدیو ہائی اسکول داناپور سے ۱۹۱۲ء میں میٹرک اور پٹنہ کالج پٹنہ سے ۱۹۱۴ء میں ایف اے کیا، پھر کلکتہ یونیورسٹی سے ہومیوپیتھی کے امتحان میں بھی امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ فرنگی طلبا کی اتالیفی اور سرکاری ملازمت ان کا ذریعہ معاش تھی۔ شاعری میں وہ سید امیر حسن بدرؔ آروی سے تلمذ رکھتے تھے۔ شاہ قتیلؔ داناپوری عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی، سنسکرت اور بھوجپوری زبان بھی بخوبی جانتے تھے اور اپنے وقت میں ''فاضل توریت وانجیل'' کہے جاتے تھے۔ انگریزی میں آٹھ کتابوں کے علاوہ اردو نثر میں ان کی کتاب ''مسئلہ مرغوب'' جسے انہوں نے اپنے سفرحج کے رفیق خاص جناب شیخ علاء الدین ہارنس مرچنٹ کی تحریک پر لکھا تھا اور ''اذکار الابرار''، ''انتساب الاخیار'' اور ''ضیاء العروض'' وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ حضرت قتیلؔ کا فارسی دیوان ''ساغر کیف'' اور ''خورشید سحر'' اردو دیوان ''تجلیات قتیلؔ'' اور رباعیوں کا دیوان ''رباعیات خاص'' بھی چھپ چکا ہے۔ حضرت قتیلؔ سید شاہ محمد شرف الدین حسین چشتی نظامی سے شرف بیعت رکھتے تھے اور ان کی رسم سجادگی ۱۹۲۶ء میں عمل میں آئی تھی۔ حضرت قتیلؔ داناپوری کا انتقال ۲۷ جولائی ۱۹۸۵ء کو ہوا۔ مزار مبارک مقبرہ آستانہ چشتیہ داناپور میں ہے۔

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر
ابرار احمد خان
سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر
انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۴ شمارہ : ۱۲
دسمبر ۲۰۲۳ء

زرتعاون : پندرہ روپے
سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ: سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476
Web : www.biharurduacademy.in
email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی
تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمد خان		۳
مقالات	اردو کے غیر مسلم شعرا کی ادبی کارگزاریاں	ڈاکٹر ناصر رضا خاں جلالی		۴
	انشاءاللہ خاں انشاؔ کا شعری مرتبہ	ڈاکٹر سید صابر حسن		۱۱
	ناشادؔ اورنگ آبادی غزلیہ شاعری کے آئینے میں	نثار احمد صدیقی		۱۴
	ایم عالم: حیات اور عمومی خدمات	ڈاکٹر ایم۔ عارف		۱۸
	کلیم الدین احمد اور ان کی تنقید نگاری	عبدالرزاق رضوی		۲۳
	شوکت حیات: ایک جینوئن افسانہ نگار	ڈاکٹر احسان عالم		۲۶
	جوشؔ: شاعری اور تنقید غزل	ڈاکٹر آسیہ پروین		۳۱
	حجاب امتیاز علی اور ان کی افسانہ نگاری	فرزانہ اسد		۳۵
افسانے	ساڑھے آٹھ جملے	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی		۳۷
	ویڈیو کال	ڈاکٹر شاہین سلطانہ		۳۹
منظومات	نعت پاک	محمد مصطفٰے غزالؔی		۴۲
	تین نظمیں	مدثر عمرؔ کیفی		۴۳
	غزلیں	سردار پنچھؔی / فردوسؔ گیاوی		۴۴
	غزلیں	جمیل احمد جمیلؔ		۴۵
	غزلیں	جاوید راناؔ		۴۶
	غزلیں	ڈاکٹر احمد منظورؔ / مظہر زاہدی		۴۷
	غزلیں	ڈاکٹر تبسمؔ فرحانہ / سمیع احمد ثمرؔ		۴۸
	غزل	اظہار الحق اظہرؔ		۴۹
کتابوں کی دنیا	ظفر کمالی: شخصیت اور......	صفدر امام قادری	مبصر : ڈاکٹر اے کے علوی	۵۰
	پھول ببولوں کے	آثرؔ فریدی	مبصر : ڈاکٹر آصف سلیم	۵۷
	وہ جو کہنا امر محال تھا	م۔ اشرفؔ	مبصر : ڈاکٹر بدرؔ محمدی	۵۸
	وقائع اخیار	مولانا الحاج شمس الہدیٰ	مبصر : زبیر احمد بھاگلپوری	۶۱
	مثنوی قطب مشتری......	پروفیسر عبدالبرکات	مبصر : ڈاکٹر محمد وسیم رضا	۶۲
	کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر	سلطان آزاد	مبصر : کاظم رضا	۶۴
وفیات	آہ! ڈاکٹر امام اعظم	ادارہ		۶۶
سلام و پیام	ڈاکٹر محمد ضیاءالدین، درخشاں جبیں، محمد سعد، صادق علی انصاری، ڈاکٹر نشاط اختر، فردوسؔ گیاوی، شبنم پروین، مصطفٰی ندیم خان غوری، زینب بانو			۶۷

بچوں کا زبان وادب

۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب''میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریه

حرفِ آغاز

اللہ کا شکر و کرم ــــــ ''زبان وادب'' کے تازہ شمارے کے ساتھ اس کی چوالیسویں جلد مکمل ہو رہی ہے۔ وقت بس دیکھتے دیکھتے گزرتا چلا جاتا ہے۔ رواں سال آیا بھی اور اب رخصت پذیر بھی ہے۔ یہ آمدورفت تو لیل ونہار کا ایک دائمی سلسلہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ گزرانِ وقت کی معنویت ہمیشہ ہی احتسابِ کردار وعمل سے وابستہ رہا کرتی ہے اور ہماری دُعا ہے کہ ہمیں اِس کی توفیق سدا نصیب ہوتی رہے۔

زیرِ نظر اشاعت کا مقالاتی آغاز اُس تحریر سے ہو رہا ہے جس میں حب الوطنی اور قومی یک جہتی کے ذہن ساز اشعار سے غذا لیتے ہوئے ''اردو کے غیر مسلم شعرا کی ادبی کارگزاریاں'' پیش کی گئی ہیں، بعد ازاں اس حصہ میں کہیں عہد وسوانح کے اشارات اور خصائص غزل کی نشاندہی کے ساتھ ''انشآء کا شعری مرتبہ'' دکھایا گیا ہے، کہیں برجستہ علمی تمہید اور سوانحی احوال کے ساتھ ''ناشآد اورنگ آبادی غزلیہ شاعری کے آئینے میں'' سامنے لائے گئے ہیں اور کہیں تہذیبی وعلاقائی ماحول ومزاج کا نقشہ دکھاتے ہوئے شمالی بہار کے فنکار ایم عالم کی زندگی اور عمومی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان مقالاتی اوراق میں کہیں نہایت جامع ومدلل انداز سے انامیت، نامیاتیت اور سن ستری جیسی اصطلاحیں وضع کرنے والے افسانہ نگار شوکت حیات کو بحیثیت جینوئن افسانہ نگار آئینہ کیا گیا ہے اور کہیں سوانحی کوائف اور فنی خصائص کے ساتھ ''حجاب امتیاز علی اور ان کی افسانہ نگاری'' پر باتیں ہوئی ہیں۔ اس حصہ میں مزید برآں ایک طرف اگر ''کلیم الدین احمد اور ان کی تنقید نگاری'' کے تعلق سے وقیع و پر نکات علمی ابتدائیہ، مختصر سوانحی تذکرے اور تنقیدی حوالہ جات کے ساتھ ان کی تین شہرہ آفاق تصانیف پر گفتگو ہوئی ہے اور اختتامیہ میں تنقیدات کلیم کے مثبت پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے تو دوسری طرف ''جوشؔ: شاعری اور تنقیدِ غزل'' میں مستند تنقیدی حوالے کے ساتھ شاعر شباب وانقلاب کی نظموں اور غزلوں کے خصائص ہی نہیں ان کے غزل مخالف نظریہ کا خلاصہ بھی لکھ دیا گیا ہے اور بایں نسبت تمام ضروری تجزیاتی ومباحثاتی اشارات کے ساتھ متوازن نتائج بھی سپردِ قرطاس کر دیے گئے ہیں۔

مقالات کے بعد اس شمارے کے افسانہ ''ساڑھے آٹھ جملے'' میں جہاں فنی اصولیات کی بالواسطہ جھلکیاں دکھاتے ہوئے ایک سفاک ادبی رویے اور روش کی عکاسی کی گئی ہے، وہیں افسانہ ''ویڈیو کال'' میں بھی آج کی اس ایجاد کے استعمال کا منفی نفسیاتی پہلو، نئی نسل کے اخلاق شکن رویے اور ممتا کی جذباتی وذہنی تڑپ سامنے لا دی گئی ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ متذکرہ مقالے اور افسانے ہی نہیں، اس شمارے کے منظوماتی اوراق اور نسبتاً پھیلی ہوئی ''کتابوں کی دنیا'' بھی حظ وانبساط کا موقع دے گی اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی ان کے لئے مسرت وآموزش کا موجب بنے گا۔

انسانی زندگی پانی کا بلبلہ ہے، افسوس کہ گزشتہ دنوں معروف ادیب وناقد اور شاعر وصحافی ڈاکٹر امام اعظم اچانک ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور اردو زبان وادب کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ زیادہ، خدا حافظ خدا ناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

مقالات

ڈاکٹر ناصر رضا خاں جلالی

اردو کے غیر مسلم شعرا کی ادبی کارگزاریاں

اردو ہندوستان کی ایک بلند پایہ زبان ہے جس میں معیاری آرٹ اور کلچر کی جلوہ سامانی ملتی ہے۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی کی بھی زبان ہے۔ مسلمانوں نے جس طرح اردو ادب کی آبیاری کی، اُس سے کسی طرح کم غیر مسلموں نے نہیں کی۔ اس ضمن میں سینکڑوں ادیبوں، شاعروں، ناقدوں، افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نگاروں کا نام گنوائے جاسکتے ہیں۔

اردو شاعری کی روایت بہت ہی قدیم ہے۔ گزشتہ صدی میں اردو کے جن غیر مسلم شعرانے ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لیا اور ملک کے مسائل میں دلچسپی دکھائی ان کے کارناموں کو مبسوط طور پر منظر عام پر لانا اوران کے خدمات کا جائزہ لے کر اقدار متعین کرنا آج کی سوسائٹی کے لئے ایکچز ولا ینفک ہے۔

گویائی انسان کا خاصہ ہے اور انسان فطری طور پر اپنے ہم جنسوں سے بات کا شائق ہوتا ہے۔ انسان کے مافی الضمیر، اس محسوسات، جذبات اور خیالات کے اظہار کا واضح ترین ذریعہ زبان ہی ہے۔ بقول غالبؔ ؎

میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

اسی مدعا کے پیش نظر اردو شاعروں نے اپنے خیالات، محسوسات اور جذبات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ نثر کے مقابلے نظم (شاعری) کو اہمیت دی گئی۔ ہر دور میں ادب اور زندگی کی قربت پر زور دیا گیا، یہاں تک کہ اردو شاعری میں ملک کی سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں سے ایک انقلاب آیا۔ بقول آل احمد سرور:

> ’’جنگ عظیم سے پہلے ہماری شاعری ایک خاموش اور پرسکون دریا کی طرح تھی، اس کے بعد اس میں طوفانوں کی تیزی اور بے مہری، تباہی اور غارت گری اور زرخیزی آ گئی۔‘‘ (نئے اور پرانے چراغ، ص ۳۲۲)

اس دور کے شعرانے اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی اور ایک نیا افق دیا۔ اردو شاعری کے اصناف میں، غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، نظم نگاری، رباعی گوئی اور نعت گوئی کو اہمیت حاصل ہے۔

اردو کے غیر مسلم شاعروں نے بھی اردو کے مسلم شعرا کی طرح مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ اپنی شاعری کے ذریعہ مختلف مسائل حیات پر روشنی ڈالی ہے اور ہندوستان کے سیاسی ماحول اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے۔

اردو کے غیر مسلم شعرانے وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہوکر مختلف ادوار میں ملکی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ بڑے بڑے غیر مسلم شعرا نے اعلیٰ درجے کی جذبات نگاری، مشاہدات فطرت کی عکاسی اور خاک وطن سے محبت کا اظہار کر کے اپنی شاعری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ درگا سہائے سرورؔ جہاں آبادی، برج نرائن چکبستؔ اور تلوک چند محرومؔ جیسے شعرا کو مثال میں پیش کرسکتا ہوں۔ سرورؔ کے یہاں وطن کی محبت، قومی یک جہتی اور آزادی کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سرور کے دو شعر نمونہ کے طور پر ملاحظہ کیجئے ؎

ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں
اس کے لئے کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو
گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اذن ہو
تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو

چکبستؔ کی حب الوطنی کا کون نہیں قائل ہوگا؟ ہندوستان کی عظمت کی نشاندہی جس انداز میں انہوں نے کیا ہے اس سے کون واقف نہیں؟ چکبستؔ نے ملک وقوم کے دکھ درد کی ترجمانی کی اور وطن کی محبت کو دلوں میں بیٹھایا۔ یہاں اُن کا ایک بند پیش کر رہا ہوں جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ وہ وطن کی محبت میں کس طرح سرشار ہیں ؎

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرّہ اس منزل کہن کا
تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کا
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کا

تلوک چند محرؔوم کی زندگی کا محور قومی اور وطنی بیداری رہا ہے۔ ان کا پیغام اکبؔرالہ آبادی، سرؔور جہاں آبادی، اسماعیؔل میرٹھی، برج نارائن چکبستؔ اور اقبالؔ سے مختلف نہیں رہا۔ ان کا شمار اس ہراول دستے کے سرفروشوں میں ہوتا ہے جنہوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑے مصلح قوم اور ترجمانِ حقیقت بھی رہے۔ حب وطن، سوز وگداز، امید اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی محرؔوم کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ان کی نظم ''کاروانِ وطن'' ایک نغمہ ہے حب الوطنی کا اور قوم پرستی کا جس میں نہایت ہی حسین وشستہ زبان میں آسمان سے باتیں کرنے والے تخیل نے نئی نئی گل کاریاں کی ہیں۔

محرؔوم نے اردو کو ایک نئی زندگی دی ہے اور اُسے نئی نئی وسعتوں سے روشناس کرایا ہے۔ ان کی قومی اور سیاسی نظموں میں حب الوطنی کے صحیح جذبات کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے وطن پرستی جھلکتی ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک نظم ''ہندوستاں ہمارا'' دیکھئے ؎

گلشن اجڑ چلا ہے اے باغباں ہمارا
ہونے کو تنکے تنکے ہے آشیاں ہمارا
کس دشت میں الٰہی اب خاک چھانتے ہیں
بادِ بہار اپنی ، آب رواں ہمارا
مت چھیڑ دل جلوں کو ایسا نہ ہو کہ تجھ کو
اے چرخ پھونک ڈالے سوزِ نہاں ہمارا
وہ دن بھی تھے کہ ہم تھے اور دھاک تھی ہماری
تھے بحر و بر ہمارے ، تھا آسماں ہمارا
سر رفعت فلک کا جھکتا تھا اپنے آگے
چرخ سے بھی اونچا تھا آستاں ہمارا
اب حال یہ ہوا ہے ہم نیم جاں پڑے ہیں
وہ اوج برتری میں رتبہ کہاں ہمارا
سالار تو اگر ہو اے اتفاق قومی
پائے کہیں تو رستہ یہ کارواں ہمارا
گو زیر دست ہیں ہم، لیکن نہ پست ہیں ہم
اتنے کہ مٹ چکا ہو نام و نشاں ہمارا
ہندو ہیں یا مسلماں ہم اہل ہند ہیں سب
محرؔوم مشترک ہے سود و زیاں ہمارا

یہ پوری نظم قومی درد اور وطنی محبت سے معمور ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سماجی، سیاسی اور معاشرتی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں براہ راست اردو کے شعرا اس سے متاثر ہوئے اور اپنی نظموں کے چراغ روشن کرتے رہے۔ آزادی کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں کسانوں اور محنت کشوں کی جو تحریکیں اٹھیں، اس میں اردو شعرا نے عملی دلچسپی لی اور مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کر کے عوام کو ان کے حل کی نشاندہی کی۔

معاشرے میں شاعر کی حیثیت جسم انسانی میں آنکھ کی مانند ہے۔ جسم میں کہیں بھی درد ہو آنکھ آنسو بہاتی ہے۔ اسی طرح شاعر ہر دور کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے اور سماج میں پیش آمدہ مسائل پر روشنی ڈالتا ہے، عوام کو بیدار کرتا ہے اور قومی مسئلہ ہو یا بین الاقوامی ہر طرح کے مسائل پر اپنے جذبات کی تاثیر پیش کرتا ہے۔ شاعر کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ ساری دنیا دراصل ایک ہی زنجیر میں بندھی ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے خواہ کتنی ہی دور کوئی واقعہ یا حادثہ ہو دوسری جگہ اس کا اثر پڑنا لازمی ہے۔ اسی طرح اقتصادی صورت حال ہی پر زندگی کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ ایک ملک کی اقتصادی محکومی دوسرے ملکوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور جنگ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو، سب کا اس سے متاثر ہونا لازمی ہے۔

جب چین نے ہندوستان کی سرحدوں پر مداخلت کی تو اس کی مذمت میں شاعر پیچھے نہیں رہے۔ وطنی محبت سے سرشار ہو کر انہوں نے قومی غیرت کو للکارا اور دشمن سے مقابلہ کرنے کی تلقین کی۔ اپنی شاعری کے ذریعہ عوام میں قومی بیداری پیدا کی۔ اس سلسلے میں جاں نثار اخترؔ کی نظم

''آواز دو ہم ایک ہیں'' کافی شہرت یافتہ ہوئی۔ مسلم شاعروں کی طرح غیر مسلم شعرا نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ دشمن کو للکارا۔ شاعروں نے قومی آزادی کو خطرے میں پایا تو اپنی تخلیقات سے ہم وطنوں کے دلوں میں حب الوطنی، یک جہتی اور اتحاد کے جذبات بیدار کیئے۔ اس ضمن میں کچھ غیر مسلم شعرا کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

پنڈت آنند نرائن ملا

آنند نارائن ملا کا اردو کے نامور شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کا تعلق کشمیری برہمن سے تھا۔ ان کے والد پنڈت جگت نرائن ملا لکھنؤ میں ایک مشہور وکیل تھے۔ آنند نرائن ملا ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ لکھنو ہی میں تعلیم وتربیت حاصل کی۔ وہ ہندوستان کی عدالتوں میں بڑے عہدوں پر فائز رہے، یہاں تک کہ جج کے عہدہ پر بھی مامور ہوئے۔ قانونی چارہ جوئی اور منصفی کے باوجود اردو شاعری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں:

> ''شروع میں انہوں نے کچھ انگریزی نظمیں لکھیں، کچھ فارسی نظموں کے انگریزی ترجمے کئے، لیکن بعد میں اردو میں لکھنے لگے۔ ان کے کلام میں گہرائی اور جذبات کی عکاسی دونوں ایک ہی جگہ ملتی ہیں۔ انہوں نے کچھ رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں، مگر بیشتر وہ سماجی اور سیاسی حالتوں کا بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو ایسے فنکارانہ طریقے سے پیش کرتے ہیں کہ ان کی اثر انگریزی بڑھ جاتی ہے اور نظم صرف ایک آئیڈیل یا خیالات کا پروپگنڈہ بن کر نہیں رہ جاتی۔ گہری حب الوطنی کے ساتھ ان کے نظریات میں انسان دوستی کا جذبہ بھی بہت زوردار ہے۔'' (اردوادب کی تنقیدی تاریخ،ص ۲۷۳)

آنند نرائن ملا کے فکروفن میں انسان دوستی کا جذبہ ایسی گہرائی اور گیرائی اور ایک ایسی قوت شفا پیدا کرتا ہے کہ اس کی طرف نگاہیں فوراً اُٹھ جاتی ہے۔ چین نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو آنند نرائن ملا نے ایک طویل نظم ''لہو کا ٹیکا'' لکھی۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک بہت ہی پر اثر نظم ہے۔ اس نظم کے آغاز کا یہ بند دیکھیں ؎

وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا
ترے ناموس پر سب کچھ لٹا دینے کا وقت آیا
وہ خطہ دیوتاؤں کی جہاں آرام گاہیں تھیں
جہاں بے داغ نقش پائے انسانی کی راہیں تھیں
جہاں دنیا کی چیخیں تھیں نہ آنسو تھے نہ آہیں تھیں
اُسی کو جنگ کا میداں بنا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

عرشؔ ملسیانی

اردو کے شہرت یافتہ شاعروں میں عرش ملسیانی کا نام بھی شامل ہے۔ انہوں نے نظمیں، غزلیں، نعتیں خوب لکھی ہیں۔ رسالہ ''آج کل'' دہلی کے مدیر رہے اور لگن کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ حکومت پنجاب نے تین سال تک انہیں پنجاب کا راج کوی مقرر کیا تھا۔ چینی جارحیت سے متاثر ہو کر ۱۹۶۲ء میں انہوں نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان ہے ''فرصت رندی کہاں ساقی'' اس نظم کے دو بند یہاں نقل کررہا ہوں، ملاحظہ کیجئے ؎

نئی ہر بات ہے بدلا ہے دورِ آسماں ساقی
ہوا ہے آگ سے روشن یہ تیرا خاک داں ساقی
سر میخانہ جو چھائی ہیں کالی بدلیاں ساقی
بہ وقت جنگ اب فرصت رندی کہاں ساقی
ترے رندوں کے ہاتھوں میں ہے اب تیغ وسناں ساقی

نہ ہے دورِ غزل خوانی نہ دورِ بزم آرائی
نہیں جچتی بتانِ ماہ وش کی شانِ زیبائی
کہاں کی بادہ آشامی ، کہاں کی بادہ پیمائی
نہ ہے جام و سبو ساقی نہ ہے رطل گراں ساقی
ترے رندوں کے ہاتھوں میں ہے اب تیغ وسناں ساقی

پورن سنگھ ہنرؔ

پورن سنگھ ہنرؔ بھی اردو کے مشہور شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مرزا احسان احمد پورن سنگھ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ابتدا میں لکھتے ہیں کہ:

''یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اردو ادب کے نشو ونما اوراس کی توسیع وترقی میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے کم حصہ نہیں لیا ہے اور وہ ہمیشہ اردو کو اپنے ملک وقوم کی ایک خاص زبان سمجھتے رہے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ موجودہ دور انقلاب نے اس کی گزشتہ فیاضانہ ذہنیت کو تنگ نظری کی اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اب اردو کو تنہا مسلمانوں کی زبان سمجھنے لگی ہیں۔ باوجود اس عام مخالفانہ رو کے ملک میں اب بھی کچھ اہل ذوق موجود ہیں جو اردو ادب کی خدمت سے غافل نہیں ہیں اور باوجود غیر مسلم ہونے کے اردو کو اپنی ہی زبان سمجھتے ہیں۔'' (مقدمہ آہنگ غزل،ص ۱۱)

ہنرؔ کی نظم ''تعمیر نو'' کے چند اشعار نمونہ کے طور پر حاضر خدمت ہیں ؎

اے مقدس سر زمیں اے کشورِ ہندوستاں
خم ہے تعظیم تیرے سامنے ہے آسماں

انتخاب ہفت کشور نام نامی ہے ترا
پایہ سب دنیا کے ملکوں میں گرامی ہے ترا

جنت ارضی بھی کہتے ہیں تجھے اہل نظر
تیرے ہی دامن میں آدم نے بنایا مستقر

خارؔ دہلوی

اردو کے غیر مسلم شعرا میں پنڈت رتن موہن ناتھ زتشی خارؔ دہلوی کا مقام کافی بلند ہے۔ خارؔ دہلوی شمالی ہندوستان کے سر برآوردہ کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل دورانِ سلطنت مغلیہ کشمیر سے ہجرت کر کے دلی میں آباد ہوا۔ خارؔ دہلوی نے غزل کے ساتھ نظم نگار کی حیثیت سے اپنا مقام بنایا۔ چین نے ہندوستان پر جب حملہ کیا اور جنگ چھیڑی تو چینی حملہ سے متاثر ہو کر ایک نظم ''اے ہند کے جوانو میرا سلام پہنچے'' سپرد قلم کیا۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ کیجئے ؎

اسلاف کے چلن پر قرباں ہونے والو
بلبل صفت چمن پر قربان ہونے والو
آزادیٔ وطن پر قربان ہونے والو
اس شمع انجمن پر قربان ہونے والو
ہو جس محاذ پر تم الفت کا جام پہنچے
اے ہند کے جوانو میرا سلام پہنچے

بھارت کے نونہالو بھارت کی لاج رکھنا
کوئی دقیقہ باقی یارو نہ آج رکھنا
جس طرح بل پڑے بس قائم سوراج رکھنا
اس مادرِ وطن کے تم سر پہ تاج رکھنا
ہو جس محاذ پر تم الفت کا جام پہنچے
اے ہند کے جوانو میرا سلام پہنچے

صابرؔ ابوہری

صابرؔ ابوہری اردو کے ایک معروف شاعر گزرے ہیں۔ وہ امن اور شانتی کے علم بردار ہیں انسانیت قومیت اور اتحاد باہمی کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ ان کا کلام اخلاقی و روحانی اقدار کا ضامن ہے۔ ان کی نظم ''جذباتِ شاعر'' کا ایک بند دیکھئے ؎

اے نفرت پھیلانے والو
دنیا کو بہکانے والو
پریم کا دیپ بجھانے والو
میری پیٹھ میں خنجر گھونپو
یا مجھ کو شعلوں میں جھونکو
لیکن میں مرنے کے ڈر سے
حق گوئی سے باز آ جاؤں
مہر و وفا کے گیت نہ گاؤں
ایسا مجھ سے ہو نہ سکے گا
مجھ سے یہ اُمید نہ رکھنا

یوگندر بہل تشنہؔ

اردو کے معتبر شاعر تشنہؔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان چلے آئے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ادبی محفلوں اور گاہ گاہ ادبی رسائل میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ تشنہؔ اپنی کاروباری مصروفیت کے ساتھ شعرو

شاعری سے بھی نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں، بلکہ باقاعدہ شعر کی تخلیق بھی کرتے ہیں۔تشنہ کی حالات حاضرہ پر گہری نظر ہے۔تشنہ کی ایک معرکتہ الآرانظم ''نالہ اردو'' نہ صرف وقت کی آواز ہے بلکہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھنے والوں کے منھ پر ایک زبردست طمانچہ بھی ہے۔ یہ ایک علامتی نظم ہے۔جس میں ان تمام ہندو شعرا اور ادبا کا ذکر آگیا ہے، جنھوں نے اردو کی آبیاری کی ہے اور اردو ہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔اُن کی مذکورہ نظم کا یہ حصہ دیکھئے ؎

یہ کس دہانے پہ لے کے پہنچے ہو مجھ کو آخر
ترقیوں کی قبا تو پہنی ہوئی ہے میں نے
ہے میرے آگے عمیق خندق
جو میری بربادیوں کا ساماں لئے ہوئے ہے
لکھی ہے شاید میرے مقدر میں
اب عجائب گھروں کی زینت
مگر تمہاری یہ خامشی بھی عجیب شئے ہے
تمہاری یہ مصلحت ہے شاید
کہ تم میرے نام کے وظیفوں کو
ہضم کرنے کی فکر میں ہو
تمہیں یہ پروانہیں ہے ہرگز
کہ میں جو تھی ایکتا کی ضامن
سمٹ سمٹ کر بس
ایک فرقے تلک ہی محدود ہورہی ہوں

پریم وار برٹنی

اردو کے غیر مسلم شعرا میں پریم وار برٹنی کا نام بھی شامل ہے۔ ان کی ایک نظم ''سوغات اردو'' کا ایک بند دیکھئے، جس میں انہوں نے اردو کو ہندوستانی تہذیب کی روح قرار دیا ہے ؎

بصد شوق تاج و اجنتا کو ہنس کر
دیا عظمت فن کا پیغام اس نے
بڑھایا وقار اس نے گنگ و جمن کا
ہمالہ کا اونچا کیا نام اس نے
یہی آن ہے سرزمین وطن کی
یہی روح تہذیب ہندوستاں ہے
یہ اردو زبان ہے، یہ اردو زباں ہے

دھرم پال عاقل

عاقل بھی اردو ایک اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں روحانیت، انسان دوستی، ثقافت اور تہذیب کی اعلیٰ قدریں پائی جاتی ہیں۔ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

پرچم روحانیت اونچا کریں پھر دہر میں
معرفت کا دل میں بحر بیکراں پیدا کریں
علم وحکمت میں ہمیں حاصل ہو پھر اوج کمال
عظمت دیرینۂ ہندوستاں پیدا کریں
مسکرائے جس سے اک اک پھول باغ ہند کا
اس طرح کا ہم نظام گلستاں پیدا کریں

کندن لال کندن

کندن لال کندن کا نام ہندو شعرا میں ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔انہوں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ قطعات اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ان کی ایک خوبصورت غزل کے دو شعر، ایک قطعہ اور ان کی دو رباعیاں دیکھئے ؎

گلستاں کے تبسم ریز پھولوں کا یہ کہنا ہے
چمن میں ہم شگوفوں کو کبھی رونے نہیں دیں گے
نہ سکھ نیچا ہے مسلم سے، نہ عیسائی ہے ہندو سے
بہم مل کر رہیں گے سب، الگ ہونے نہیں دیں گے

ایسا قانون ایک ہو جاری
قاتلوں کو سزائے موت جو دے
دلہنوں کو جلا نہ پائے کوئی
ہے مری مانگ یہ حکومت سے

مشکلوں میں ہمیں پھنساتی ہے
آفتیں نو بہ نو یہ ڈھاتی ہے

بادہ نوشو تم اس سے دور رہو
ہر مصیبت یہ سر پہ لاتی ہے
دیش اپنا ہے نیک کاروں کا
دھرم والوں کا دین داروں کا
مئے گساروں کا اس میں کام ہی کیا
یہ تو کندن ہے جاں نثاروں کا

جگدیش سہائے سکسینہ

جگدیش سہائے شاہ جہاں پور (یوپی) کے ایک وکیل ہیں۔ جکبستؔ اور سرورؔ کے بعد ہندوؤں میں قابل قدر نظم گو شاعر ہیں۔ نادر تشبیہات، دل پسند استعارات اور فطرت کی عکاسی ان کی نظموں میں پائی جاتی ہے۔ وہ بڑے انسان دوست اور رمز شناس فطرت شاعر ہیں۔ انہوں نے ہمالہ پر ایک طویل نظم لکھی جو اقبالؔ کی نظم ''ہمالہ'' سے معیار میں کسی طرح کم نہیں۔ اس نظم کا ایک بند دیکھئے ؎

اے ہمالہ تو ازل سے ہے نگہبانِ وطن
سلسلہ تیرا ہے اک حد خیابانِ وطن
رفعتوں سے تیری پیدا شوکت و شانِ وطن
تیری ہستی پر ہیں نازاں نوجوانانِ وطن
آسمانوں سے جو سرگرم سخن رہتا ہے تو
داستانِ عظمت ہندوستاں کہتا ہے تو

شرؔر فتح پوری

شرؔر فتح پوری نے نظمیں، مثنوی اور مسدس جیسی صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہ زمانے کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی نظم ''شہر'' کا ایک بند دیکھئے ؎

یہ اگتے شہر
انسانوں کے جنگل
جہاں تفریق، بنیادِ فصیل و بام و در ہے
جہاں تخصیص، ایجادِ ہنر ہے
جہاں سرمایہ کی صنعت گری نے
تضادِ زیست کا ہر نقش عریاں کر دیا ہے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

اردو کے غیر مسلم شاعروں میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کا نام مشہور زمانہ ہے۔ بیدی خاندان کے چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے ان کا سلسلہ نسب سکھ دھرم کے بانی حضرت بابا گرونانک دیو سے ملتا ہے۔ جناب کے، ایل نارنگ ساقیؔ نے سحرؔ کی شاعری کے ہشت جہت پہلو پر ''ہمارے کنور صاحب'' کے نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''وہ شاعر بھی تھے اور شکاری بھی، سرکاری افسر بھی تھے اور بڑے زمین دار بھی، غریبوں کے ہمدرد بھی اور امیروں کے دوست بھی ادب نواز بھی اور ادیب نواز بھی۔ دوست نوازی اور دل نوازی کے باعث وہ اپنی ذات میں ایسی انجمن کا درجہ رکھتے تھے جہاں ادب، ثقافت، تہذیب، شرافت اور انسانیت ایک ہی مسند پر جلوہ گر ہوں۔ وہ قومی یکجہتی کے علم بردار بھی تھے اور دہلی کی تہذیب وتمدن کے آئینہ دار بھی۔''

کنور صاحب کی ایک نظم کا یہ بند دیکھئے ؎

فضاؤں سے برستا ہے ہر اک سو نغمۂ شادی
مبارک آپ کو ہم کو ہو سب کو جشن آزادی
مگر مجھ کو بھی کہنا ہے یہاں کچھ بن کے فریادی
یہ آزادی نہ بن جائے ہماری وجہ بربادی
ابھی ہشیار رہنا ہے ہمیں ان چیرہ دستوں سے
بچانا ہے ابھی اس دیش کو فرقہ پرستوں سے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اردو کے بہت ہی بلند پایہ شاعر، نکتہ رس، محقق اور شریف النفس انسان تھے۔ اردو کے غیر مسلم شعرا میں ایک باوقار اور مستحکم شاعر کی حیثیت سے اردو ادب وشاعری کی خدمت کرتے رہے اور غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہتے رہے۔ انہوں نے کسی ہم عصر شاعر کا رنگ قبول نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں تمام ترقی پسند عناصر موجود ہیں، لیکن ان کا رنگ منفرد ہے اور وہ اپنی ڈگر پر آخری عمر تک کامیابی سے

چلتے رہے۔ پروفیسر آل احمد سرور رقم طراز ہیں کہ:

''ان کے یہاں نئے رجحانات کے ساتھ مشرقی کلاسیکل ادب کی روح اور زندگی کے جمالیاتی پہلو کا احساس بھی ہے۔ان کی شاعری مقصدی ہے اور اُس میں مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت کا بھی سامان ملتا ہے۔ان کے یہاں فن کار کی ایک خلش، بے چینی اور غم بھی ہے۔''

(جگن ناتھ آزاد اور ان کی شاعری، ص ۲۴۰)

سردار جعفری کا یہ بیان بھی یہاں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں:

''جگن ناتھ آزاد کو شاعری ورثے میں ملی، لیکن وہ اس میراث پر قانع نہیں رہا۔ اس نے خود اپنی کاوش سے شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے اور اس میں اپنے خون جگر کا اضافہ کیا ہے۔اس کی شاعری میں ماضی کی بہترین فنی روایات نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آزاد کا موضوع دکھیا انسانیت اور اُس کی تمنائیں ہیں۔اس کے ہر شعر میں ماحول کی سخت گیری کا احساس ہے جس نے اس کی شاعری کو گمبھیر بنا دیا ہے، لیکن اس دم گھونٹ دینے والی فضا سے باہر نکل آنے کی خواہش نے اس کی شاعری میں تڑپ اور حوصلہ مندی بھی پیدا کی ہے، اس لئے اس کی شاعری ایک زخمی دل کی پکار ہی نہیں بلکہ عہد حاضر کے انسان کی للکار بھی ہے۔کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ درد، تپش، اُمنگ اور حوصلہ مندی کے امتزاج نے اُس کی شاعری کو بہت خوشگوار بنا دیا ہے۔'' (قاضی نذر الاسلام)

آزاد کی ایک نظم ''ابوالکلام آزاد'' کا ایک بند دیکھئے ۔

ابوالکلام اے کاروانِ علم وحکمت کے امیر
مرشد روشن بصر ، روشن دل و روشن ضمیر
آسمان جذبہ اخلاص کے مہر منیر
تو نے دنیا کو دکھا دی عظمت و شان فقیر
فاش تھی تیری نگاہوں پر نمودِ زندگی
تیرا ہر نکتہ ضمیر اندر وجود زندگی

میں نے یہاں صرف چند شعرا کا تذکرہ کیا ہے جس سے اندازہ لگانا آسان ہے کہ اردو کے غیر مسلم شعرا نے اپنی شاعری کے ذریعہ سیاسی، ادبی اور مذہبی شخصیتوں کے کارنامے جس طرح اُجاگر کئے ہیں ان کے مطالعہ سے یقیناً نوجوانوں میں تازہ شعور بیدار ہوگا اور اس سے عوام کو سبق آموزی کا موقع ملے گا۔

یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ شاعر کا کلام بہرصورت اس کے دلی جذبات کا آئینہ ہوتا ہے، جس میں اس کی فطری خصوصیتیں، مزاجی اور فکری کیفیات، اس کے گردوپیش کے حالات، رجحانات، اثر انداز واقعات وحادثات، اس کے مشاہدات وتجربات اور اس کے کردار کے نمونے جذب رہتے ہیں، جنہیں اس کے کلام سے ڈھونڈ نا ادراک کا کام ہے۔فن اور ادب نوع انسانی کا بیش قیمت تجربہ ہے، جس سے انسان کی بلند فکری اور گہرے احساسات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح شعرا کے تخلیقی ادب سے فہم وادراک کی روشنی میں دوسروں کے لئے اسے استفادہ کا باعث بنایا جاسکتا ہے۔ ❁❁

نہایت ضروری

☆ قلم کار حضرات! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code، مکمل پتہ اور موبائیل نمبر بھی تحریر کریں۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔

☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں اور تمام مطلوبہ تفصیلات لکھیں۔

☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔شکریہ!

ڈاکٹر سید صابر حسن
C 314 Abul Fazal Enclave-2, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025 (Mob.9801659311)

انشاءاللہ خاں انشاؔء کا شعری مرتبہ

انشااللہ خاں ۱۷۵۲ء میں مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں اپنے والد میر ماشاءاللہ کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے، پھر کچھ دنوں بعد فرح آباد کا رخ کیا۔ اوائل عمری سے ہی انہیں شعروشاعری سے رغبت تھی۔ انہوں نے اپنے والد سے اپنے کلام پر مشورہ لیا اور پھر میر سوزؔ کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ انشاؔء کے والد بڑے عالم تھے، اس لئے انشاؔء کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم ملی۔ ذہین طبع واقع ہوئے تھے، جس کی وجہ سے کان طبع سے اعلیٰ مرتبہ کے اشعار نکالتے تھے جو کہ عوام میں مقبول ہوتے تھے اور اسی وجہ سے انہیں عزت وشہرت بھی نصیب ہوئی۔ انشاءاللہ خاں شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی چلے آئے اور یہاں مستقل اٹھارہ سال تک قیام پزیر رہے اور جب شاہ عالم بادشاہ بصارت سے محروم کر دیے گئے جس کی وجہ سے شعروسخن کی محفلیں بے کیف اور بے رنگ ہوگئیں اور پوری فضا سنسان، تب بھی انشاؔء اپنی زندہ دلی، ہنسی اور دل لگی سے زندگی میں تازگی قائم کئے رہے، مگر آخر کار ان کو لکھنؤ کا رخ کرنا پڑا جہاں معاشی خوشحالی بھی تھی اور شعروشاعری کی محفلیں بھی پر رونق تھیں۔

لکھنؤ میں وہ مرزا سلیماں شکوہ کی آراستہ محفل کی زینت بنے۔ یہاں مصحفیؔ کے ادبی معرکوں سے ان کا رنگ سخن بدل گیا۔ ابتذال اور سوقیانہ پن جو کہ لکھنؤ کی شعری زندگی میں رچ بس گیا تھا، اس سے انشاؔء کی طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ لکھنؤ کی شعری محفل میں جراؔت اور مصحفیؔ کا بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ انشاؔء بھی اس محفل کا حصہ بن گئے۔ بزم مشاعرہ منعقد ہونے لگی۔ چوٹیں چلتیں، سوانگ بھرے جاتے اور مزاح کا رنگ طنز و تنقیص میں تبدیل ہوجاتا اور معاصرانہ چشمک میں اتنی شدت آجاتی کہ شرافت کی ساری قدریں مسمار ہوجاتیں۔ اس صورت حال سے مصحفیؔ بہت مضطرب و پریشاں ہوئے، مگر انشاؔء اس محفل میں شاداں وفرحاں رہے کیونکہ یہ ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ لکھنؤ کی زندگی عیش وعشرت سے معمور تھی۔ معیار شاعری پر عریانیت اور فحاشی نے اپنی جگہ بنالی تھی جس کا بے حد اثر جراؔت، انشاؔ اور رنگینؔ کی شاعری میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

لکھنؤ کا قیام انشاؔ کی زندگی کا ہنگامہ خیز اور زرخیز ترین دور تھا۔ یہاں مرزا سلیمان شکوہ اور سعادت علی خاں کی صحبت کی بدولت معاشی الجھنوں سے نجات حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوئے اور خوشحال اور شان وشوکت کی زندگی بسر کرتے رہے اور اسی لئے انہیں تخلیقی جوہر کو جلا بخشنے کا پورا موقع ملا اور ان کی جولانی طبع رنگ لانے لگی۔

انشاءاللہ خاں انشاؔء کی زندگی مختلف رنگوں کا مجموعہ تھی۔ ان کا ادبی مقام بہت بلند تھا۔ وہ ماہر لسانیات بھی تھے اور کہانی لکھنے کا بھی ذوق رکھتے تھے، مگر بنیادی طور پر وہ ایک کامیاب شاعر تھے۔ اردو شاعری میں ایک نابغہ روزگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہیں ہمیشہ اپنی نمائش کی فکر بھی رہتی تھی۔ لوگوں کی توجہ پنی طرف مبذول کرانے کی بڑی خواہش ان میں پائی جاتی تھی، اسی لئے انہوں نے لکھنؤ میں مختلف رنگوں میں ڈوبی ہوئی رومانی شاعری کو اختیار کیا، جب کہ فحاشی وعریانیت کے اس ماحول میں مصحفیؔ نے معیار ادب کو قائم رکھا اور خالص ادبی شاعری کی اہمیت کا احساس دلایا جو کہ تہذیبی قدروں کی نمائندگی کرتی تھی۔

مصحفیؔ کے قدموں میں بھی کہیں کہیں لغزش ہوئی، مگر مجموعی طور پر وہ شاعری میں اپنا حقیقی جوہر دکھاتے رہے، جب کہ انشاؔ لکھنؤ کی تہذیب میں رچ بس گئے تھے، لہٰذا وہ ہمیشہ بازار حسن میں کھوئے رہے اور بازار حسن کی تکمیل میں اپنے اشعار سے مصرف لیا، پھر بھی ان کے یہاں معیاری اور اعلیٰ پایہ کی شاعری کی کمی نہیں جس کا حسن دامن دل کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ ان کے غزلیہ اشعار جاذب نظر ہیں اور کہیں

کہیں وہ روایتی شاعری سے انحراف کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ چند اشعاران کی غزلوں کے اس رنگ میں بھی ہیں۔

پیدا ہوا جی عشق سے جب سنگ میں کیڑا
پھر کیوں نہ پڑے زخم دلِ تنگ میں کیڑا
لچھے ہیں یہ ریشم کے نہ یہ خط شعاعی
ہے مہر بھی ایک عالم نیرنگ میں کیڑا

اجی چشم بد دور نام خدا
تمہیں کیا بھلا سرخ جوڑا لگا
یہ دکھتی نگاہوں سے گھورا مجھے
کہ دکھنے مرے دل کا پھوڑا لگا
لگی کہنے انشاؔ کو شب وہ پری
مجھے بھوت ہو یہ نگوڑا لگا

انشاؔء ذہنی اضطراب، پرشور ماحول اور شوخ مزاجی کی طرف مائل رہے۔ کیوں کہ لکھنؤ کی عشرت پسند زندگی ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی جس سے دامن بچانا ان کے لئے مشکل تھا، اس لئے ان کی غزلوں میں داخلی اثرات کے مقابلے میں خارجی اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ وہ جرأتؔ اور رنگینؔ کی شاعری سے زیادہ متاثر ہیں۔ انشاؔء نے معنوی انتشار کی جگہ معنوی وحدت کو ترقی دی۔لکھنؤ کی تہذیبی زندگی معنوی وحدت کی منتظر تھی۔ انشاؔ، جرأتؔ اور رنگینؔ نے لکھنؤ کے رنگین رومانی ماحول کو اپنی غزلوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

انشاؔء کے یہاں ایسی غزلیں بھی ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کے خارجی ماحول کی نشاندہی کرتی ہیں جہاں انشاؔء کی طبعی شگفتگی وتازگی کا حسن برقرار ہے اور ان کی نشاطیہ رنگ کی غزلیں ان کی طبیعت کی تیزی و سنجیدگی اور ادبی معیار کی گواہی دیتی ہیں جب کہ کیڑا پتھر جیسی غزلیں جو انشاؔء کے زمانہ میں بام عروج پر تھیں، گردش زمانہ کے سبب ادبی تاریخ میں صرف محفوظ ہوکر رہ گئی ہیں، مگر ان کی نشاطیہ غزلیں قاری کو اپنی طرف آج

بھی متوجہ کرتی ہیں مثلاً ایک غزل کے چنداشعار دیکھئے۔

آئے نہ آپ رات جو اپنے قرار پر
گزری قیامت دل امیدوار پر
سو سو طرح شکل دکھاتا ہے کیا کروں
عکس شگوفہ ہے جو پڑا آبشار پر
ہو کر ترانہ سنج لب جو کے پاس بیٹھ
سوسوطرح سے جھاڑتے ہیں اپنے ہزار پر
انشاؔ سے اب تو آنکھ چراوے یہ قہر ہے
اس وقت میں تو رحم کر اس کے خمار پر

انشاؔء کی یہ مرصع غزل سرتاپا رنگ تغزل میں ڈوبی ہوئی اور ان کی دلچسپ غزل گوئی کی ایک اہم مثال پیش کرتی ہے۔محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف ''آب حیات'' میں انشاؔء کی غزلوں کو خوب سراہا ہے اور لکھا ہے کہ:

''انشاؔء کی غزلوں کا دیوان، عجب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاوروں کی نمکین ترکیبوں کی خوش نما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں، مگر یہ عالم ہے، ابھی کچھ ہیں، ابھی کچھ ہیں۔ جوغزلیں یاغزلوں میں اشعار بااصول ہوگئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جاپڑی وہاں ٹھکانا نہیں۔''

علی جواد زیدی اپنی انگریزی تصنیف "A history of urdu literature" میں انشاؔ کی غزلوں کی خوبیوں پر یوں لب کشائی کرتے ہیں:

"Despite the excesses he permitted himself in diction and style he remain a notable poet. Quite a few of his ghazah have the right quality of lyricism and artistic expression The element of mellowness is then, Which he tries to make up by intelligent and cosmopolitan sophistication." (P. 135)

انشاؔء کے مزاج میں رومان پرستی اور عشق مجازی کے عناصر غالب تھے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ لکھنؤ کی رومانی فضا اور جنسی کشش میں وہ گھل مل گئے

تھےاور پھراس رنگ ومزاج کے اشعاران کے قلم سے نکلنے لگے ۔

کیوں پڑی چھلکیں نہ آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے
ہے دلِ صد پارہ کو سیماب کا سا اضطراب
روح کا یہ حال ہے یاں قافلے سے پڑ کے دور
کر رہی ہے جس طرح محمل میں لیلیٰ اضطراب
اس کی چاہت میں جوانی اپنی جو تھی چل بسی
ہے پر اب تک جی کو اک جیسے کا تیسا اضطراب
پیرو مرشد کا یہ مصرع حسب حال انشاؔ کے ہے
مر مٹے پر بھی گیا اپنے نہ دل کا اضطراب

انشاؔ کے یہاں لفظوں کے حیرت انگیز کرشمے نظر آتے ہیں۔لفظوں کی جادوگری ان کے علم اور تجربوں کی غمازی کرتی ہے۔ان کے اندر تعلی، خود بینی اورخودنمائی کی کیفیت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، جس کے سبب وہ دوسرے شعرا کو اپنی خاطر میں نہیں لاتے تھے اوراس کا بہ بانگ دہل اعلان بھی کرتے تھے۔ان کی ایک رواں دواں پر کیف و پر بہار غزل کے چند اشعار دیکھئے جو کہ لذت شعری سے معمور ہیں ۔

ایک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے
کیا منہ ہے کہ ارسطو جو کرے چوں مرے آگے
کیا مال بھلا قصر فریدوں مرے آگے
کانپے ہے پڑا گنبد گردوں مرے آگے
منھ دیکھو تو نقارچی پیر فلک بھی
نقارے بجا کر کہے دوں دوں مرے آگے
ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے
بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے
کیا آکے ڈراوے مجھے زلف شب یلدا
ہے دیو سفید سحری جوں مرے آگے

جب انشاؔ کی متلون مزاجی قابو میں آتی تھی اور وہ پرسکون ہو جاتے تھے تو بڑی بجی سنوری اور دل پزیر غزل سپر دقلم کرتے تھے۔انشاؔ کی ایسی غزلوں کا رنگ وآہنگ بڑا پر کیف ہوتا تھا اور علم وفن کے میزان پر کامیابی سے ہمکنار۔ذیل میں قاری کے لطف خاطر کے لئے انشاؔ کی ایک مرصع غزل کے کچھ اشعار پیش ہیں جن میں زندگی سانس لیتی نظر آتی ہے ۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر وتحمل ، آہ، ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

انشاؔ کولکھنؤ کی شعری دنیا میں اپنے کمال شاعری کے مظاہرہ کا بھر پور موقع ملا۔ملکہ شاعری پر پوری دسترس کے سبب غزلوں کے اشعار شعریت و لذت سے وابستہ ہوتے تھے اور قاری کے دل و دماغ کے لئے سامان فرحت وانبساط۔انشاؔ کی یہ خوبصورت غزل دیکھئے ۔

جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شئے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا
نکل کر وادئ وحشت سے دیکھ اے محبوب
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقہ لیلا
گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درون کوہ سے نکلے صدائے واویلا
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشاؔ
نسیم صبح جو چھوٹی جائے رنگ ہو میلا

انشاؔء کا انتقال ۱۸۱۷ء میں ہوا، بسنت سنگھ نشاطؔ نے ''عرفی ٔ وقت بود انشاؔء'' سے ہجری سال وفات نکالا ہے۔ ❁❁

نثار احمد صدیقی
"Muslimabad, Near Goverdhan Maidan, P.o. Haspura, Aurangabad - 824120
(Bihar) (Mob. 9546308801)

ناشادؔ اورنگ آبادی غزلیہ شاعری کے آئینے میں

''حقیقی شاعری مطالعہ فن، تکلف اور تصنع کے بغیر پیدا ہوتی ہے، جس شاعری کے فن کو سیکھنے کے لئے محنت شاقہ اور دماغ سوزی کرنا پڑے وہ اصل شاعری نہیں، محض بناوٹ اور تصنع ہے۔''

مندرجہ بالا جملہ بٹلر کا ہے، اسی جملے کی روشنی میں ناشادؔ اورنگ آبادی کی غزلیہ شاعری کو یہاں پرکھنا اور دیکھنا ہے کہ انہوں نے شاعری کی زبان سے کیا کہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''آمد'' اور ''آورد'' کی شاعری میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ حقیقی شاعری ''آمد'' کی شاعری ہے جب کہ ''آورد'' کی شاعری محنت شاقہ، دماغ سوزی کی شاعری ہے، اسے لاشعوری اور شعور کی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ ''آمد'' کی شاعری لاشعوری ہے اور ''آورد'' کی شاعری شعوری۔ ان دونوں شاعری میں بہت زیادہ فرق ہے۔ ''آمد'' یا لاشعوری کی شاعری میں خیالات کی بلند پروازی دیکھنے کو ملے گی اور کچھ نہ کچھ فنی خامیاں بھی یقیناً نظر آئیں گی، جب کہ ''آورد'' یا شعوری شاعری میں خیالات کی بلند پروازی نظر آئے گی، لیکن اس میں شاعری کی فنی خامیاں بھی دور دور تک نظر آئیں گی۔ جگرؔ مراد آبادی کی شاعری کو دیکھئے، ان کی شاعری میں کچھ نہ کچھ فنی عیب نظر آئیں گے، لیکن جگرؔ کے خیالات کی بلند پروازی کا مقابلہ کون کرسکتا ہے؟ نوحؔ ناروی کی شاعری کو دیکھئے تو ان کی شاعری میں کہیں بھی جھول نہیں۔

اردو شاعری دو صنف سخن میں منقسم ہے۔ ایک غزل، دوسری نظم، نظم میں کئی اصناف ہیں جیسے حمد، نعت، مدح، سلام، منقبت، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، تضمین، روایتی نظم، پابند نظم، موضوعاتی نظم، آزاد نظم، جدید نظم، نثری نظم، اسی طرح غزل میں بھی پابند غزل، روایتی غزل، جدید غزل، ترقی پسند غزل، نثری غزل، آزاد غزل اور کئی جدید ترین شعری تجربات دیکھنے کو ملیں گے، لیکن ان تجربات کے باوجود آج بھی اردو شاعری روایتی غزل سے اپنے دامن کو سجائے ہوئے ہے۔ اردو شاعری کے مصلّے پر غزل آج بھی بارگاہ سخن میں دوزانو ہے اور زبان صنف غزل کے اشعار سے محو دعا۔

اردو زبان میں جب بھی شاعری کا ذکر کیا گیا یا کیا جاتا ہے، اہمیت واولیت غزل کو ہی دی جاتی ہے کیونکہ غزل سے ہی اردو زبان کو آبرو اور سرخ روئی حاصل ہوئی ہے۔ یہ انسان کی سوچ، جذبات و احساسات اور اس کے ذہن کی امین ہے۔ ویسے اردو دنیا کے مشہور و معروف ناقد کلیم الدین احمد نے ''غزل کو نیم وحشی صنف سخن'' کہا ہے جس پر کافی بحث مباحثہ ہو چکا ہے۔

غزل کے لغوی معنی صنف نازک سے باتیں کرنے، اس کے حسن کی تعریف کرتے، جسم کے ہر حصے کو شگفتہ الفاظ میں بندش دینے تک محدود ہے، مگر یہ غزل کے ابتدائی دور کی باتیں ہیں۔ زمانہ بدلتا گیا تو غزل میں تنوع بھی آتا گیا۔ اس کی ساخت تو وہی ہے، لیکن اس کی تعمیر میں نئے نئے شہتیر لگائے گئے، پھر اس نے گل وبلبل، لب ورخسار، گلشن وقفس، وصال وہجر اور خوابیدہ راتوں کے نالہ وفغاں سے فرار حاصل کرتے ہوئے زندگی میں درآئے عصری مسائل کو بیان کرنا شروع کردیا۔ یہ ایک جانب جدید لہجہ اور عام زندگی کے محدود وسائل اور لامحدود مسائل کے حل کی تلاش کا باعث ہوئی اور دوسری جانب اس کے فکر و خیال میں بالیدگی بھی آئی۔

غزل انسان کے جذبات اور افکار کی شیریں بیان ترجمان ہے اور یقیناً ولیؔ دکنی، غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، جگرؔ، فراقؔ، فیضؔ، شادؔ عظیم آبادی، مجروحؔ، جاں نثار اخترؔ، جمیلؔ مظہری، ساحرؔ لدھیانوی، کلیم عاجزؔ،

قتیلؔ شفائی، رشیدہ عیاںؔ، احمد فرازؔ، رمزؔ عظیم آبادی اور واقفؔ عظیم آبادی تک اُن شاعروں کی ایک طویل فہرست تاریخ ادب کے اوراق میں محفوظ ہے، جنہوں نے غزل کے دھنک رنگ آنچل میں پناہ لی ہے۔

آج اس دور میں بھی جمیل عالی، شمس الرحمٰن فاروقی، انور سدید، جاوید اختر، علیم اللہ حالیؔ، کرامت بخاری، پروین شیرؔ، ظفر گورکھپوری، ہربنس تصورؔ، صدیقؔ فتح پوری، نذیرؔ فتح پوری، سیفیؔ سرونجی اور کئی دوسرے شعرا غزل کے گیسو کو سنوارنے وسجانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ بہار کے جدید غزل شعرا خورشید اکبرؔ، عالم خورشیدؔ، شاہد اخترؔ، خورشید طلبؔ، قوسؔ صدیقی، ظفرؔ صدیقی، سلطان اخترؔ، عین تابشؔ، منیرؔ سیفی، شبیر حسن شبیرؔ اور ناشادؔ اورنگ آبادی کے نام بھی قابل ذکر ہیں، بالفاظ دیگر غزل نے ولیؔ سے لے کر آج ناشاد اورنگ آبادی تک ہر دور میں سماجی، لسانی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی اثر قبول کیا ہے، اسی نقطہ نظر سے ناشادؔ اورنگ آبادی کی شاعری کا جائزہ لینا یہاں مقصود ہے کہ انہوں نے غزل کے نام سے کیا کیا لکھا اور ان کی شاعری میں ''آورد'' ہے یا ''آمد''، لیکن اس کے قبل ناشادؔ اورنگ آبادی کا مختصر تعارف قارئین ادب سے کرانا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

شہر اورنگ آباد (بہار) زمانہ قدیم سے ہی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس شہر سے کچھ دور داؤد نگر کے نزدیک قصبہ شمشیر نگر میں عین الحق خاں ناشادؔ اورنگ آبادی ابن محمد ہدایت اللہ خاں ۱۵؍جنوری ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ قصبہ میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ھسپورہ ہائی اسکول سے میٹرک کیا، پھر بی کام کرنے کے بعد وہ محکمہ ریلوے میں ملازم ہوگئے۔ ناشادؔ اورنگ آبادی نے ۱۹۶۵ء سے باضابطہ طور پر شاعری شروع کیا۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور ان مجموعوں پر ہندو پاک کے مشہور ناقدوں نے تعریفی وتوصیفی مضامین لکھ کر مبارک باد بھی دیا ہے۔ ۲۰۱۷ء میں ڈاکٹر خورشید انور نے ناشادؔ صاحب کے فن شاعری و شخصیت پر ''ناشادؔ اورنگ آبادی: شخصیت اور شاعری'' نام سے اردو دنیا کے سامنے ایک کتاب پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ہندو پاک کے جید نقادوں کے مضامین یکجا ہیں جن کے مطالعہ سے مجموعی طور سے ناشادؔ اورنگ آبادی اور ان کی شاعری سے بھرپور اور مکمل واقفیت حاصل ہوجاتی ہے۔ یہ کتاب اردو ریسرچ اسکالرز کے لئے بھی مفید ہے۔

ناشادؔ اورنگ آبادی اگرچہ غزل، نظم، قطعہ، رباعی، حمد، نعت اور منقبت ادبی دنیا کے سامنے پیش کرچکے ہیں، مگر ان کی پہچان اصلاً غزلیہ شاعری سے ہے۔ حقیقی معنوں میں جو خوبی غزلیہ شاعری میں ان کے یہاں ہے وہ کسی دوسری شعری تخلیق میں نہیں ملتی۔ غزل کے ذریعے بڑے اچھے اور سلجھے انداز میں اپنے خیالات کو پیش کرنے میں جو مہارت ناشادؔ صاحب کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے، وہ بہار کے دوسرے شعرا کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ میں انہیں ایک کامیاب غزل گو مانتا ہوں۔ ان کی غزلیہ شاعری خونِ دل، خونِ جگر سے لکھی ہوئی نظر آئے گی، ایسی شاعری جو ایک تہذیب کو جنم دیتی ہو اور یہی انسانیت کی صحیح پہچان بھی ہے۔

ناشادؔ اورنگ آبادی نے جو کچھ بھی لکھا وہ اپنی کڑی ریاضت سے اور اپنے خونِ جگر سے تحریر کیا اور فکر وفن کے پودوں کی آبیاری کی۔ انہوں نے انسانیت کی صحیح راہ کے لئے بھی اشعار کہے ہیں۔ ان کے اشعار دل سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں جو دل پر اثر کرتے ہیں۔ ناشادؔ صاحب شاعری کے حسن اور اس کے فنی اقدار کی پاسداری بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک شاعر ساری انسانیت کا درد اپنے سینے میں چھپائے رکھتا ہے اور یہ حساس شاعر کے لئے ضروری بھی ہے۔ ناشادؔ اورنگ آبادی نے زندگی کے ہر چھوٹے بڑے تجربے کو نہایت عمدگی سے اپنے شعری قالب میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کیا ہے جو لائق تحسین ہے۔ انہوں نے لہجے کی ندرت، خیالات کے تنوع اور احساس کی تازگی سے روایت کے دائرے کو بھی وسعت اشعار بخشی ہے۔

ناشادؔ اورنگ آبادی کے اشعار سہل، سادہ، شگفتہ ہیں جنہیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناشادؔ اورنگ آبادی کو زبان وفن پر بھی قدرت حاصل ہے۔ ناشادؔ صاحب نہ صرف غزل گوئی بلکہ تقدیسی شاعری خصوصاً نعت گوئی کی جانب بھی عشق و عقیدے سے مائل نظر آتے ہیں۔ نعت گوئی کے لیے حب رسول کے جذبہ صادق کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر نعت گوئی ممکن

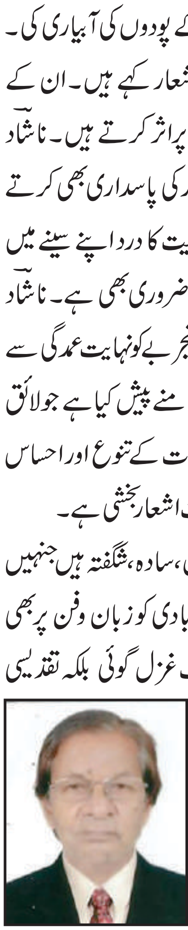

نہیں۔ ناشاد صاحب نے بڑی اور چھوٹی دونوں بحروں میں حمد ونعت تخلیق کی ہے، ملاحظہ فرمائیں ؎

تو ہی آقا تو اَن داتا تو ہی پالنہار
سب کی منزل کے لئے راہ کرے ہموار

تو چاہے تو آجائے صحرا میں سیلاب
ورنہ باتوں بات میں دریا ہو بے آب

اب نعت کہنے کا انداز دیکھئے ؎

بہت آتے رہے ہیں انبیا پیغام حق لے کر
شہ مرسل سا دنیا میں مگر کوئی نہیں آیا

وہی شمس الضحیٰ ہیں اور وہی بدرالدجیٰ بھی ہیں
سراپا وہ اُجالا ہیں اجالا شمع قدرت کا
انہیں کی ذات سے ناشاد ہر دروازہ کھلتا ہے
محبت کا، شجاعت کا، شریعت کا، طریقت کا

حمدیہ ونعتیہ شاعری کے علاوہ جہاں تک ناشاد صاحب کی غزل گوئی کا معاملہ ہے، ان کی غزلوں میں دبستان دہلی بھی دیکھنے کو ملے گا اور دبستان لکھنؤ بھی، لیکن یہ عظیم آباد دبستان سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کی شاعری میں دونوں دبستانوں کی جھلک موجود ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے مسائل کو بھی شاعری کا موضوع بنا کر اردو شعروادب کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ گردو پیش کو جذبہ اور احساس کے چراغوں سے روشن کرنے کا عمل ماضی بعید میں بھی ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے۔ دیکھئے ؎

وہ اور ہوں گے جنہیں دشمنوں سے شکوہ ہے
ہمیں تو دوست ہمارے فریب دیتے ہیں

کوئی روٹی کو پریشان تو روزی کو کوئی
خوش نہیں ہے کوئی انساں سنو یا نہ سنو
ہے کہیں شور، کہیں چیخ، کہیں ہنگامہ
آنے ہی والا ہے طوفاں سنو یا نہ سنو

مندرجہ بالا اشعار سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حالات حاضرہ پر بھی شاعر کی نگاہ ہے اور وہ اپنے اشعار کے ذریعہ عوام کو خبردار کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ اب دیکھئے ناشاد اورنگ آبادی اپنی غزل میں عشق ومحبت کی باتیں کیسے اور کس طرح کرتے ہیں ؎

ہیں تری نذر دل و جان کہ جانم تو نے
آنکھوں آنکھوں سے سہی پیار کا اعلان کیا

پھر شاعر اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

فخر ہے تجھ پہ مری جان غزل کہ تو نے
جا کے کاشی میں مرے واسطے اشنان کیا

اتنا ہی نہیں شاعر اپنی محبوبہ کی خوبصورتی، اس کے مرمریں جسم اور ہرنی جیسی چال کو دیکھ کر خدا کا شکر یوں ادا کرتا ہے ؎

تری کافر ادا سیمیں بدن اور چال میں مستی
تجھے قدرت نے ہر صورت سے مالا مال رکھا ہے

پھر شاعر حقیقت پر مبنی شعر میں عوام سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے ؎

وہاں برستی ہے لعنت خدا کی روز وشب
بڑے بزرگوں کا جس گھر میں احترام نہ ہو

یہ حقیقت ہے کہ جس گھر میں بڑے بزرگ کا احترام نہ ہو، اس گھر میں کبھی بھی برکت دیکھنے کو نہیں مل سکتی ؎

تری نگاہ کے موہوم سے اشارے پر
فلک سے چاند ستارے بھی توڑ لائیں گے

مندرجہ بالا شعر لکھنو دبستان کی شاعری کی یاد دلاتا ہے۔ اب دیکھئے ایک اور نہایت ہی خوبصورت شعر ؎

قسمت نے مجھ کو تجھ سے پرے کر دیا ضرور
دل کے قریب تیری ہی صورت ہے آج بھی

پھر آگے شاعر اپنی محبوبہ سے پوچھتا ہے ؎

جان من، جان جگر، جان تمنا یہ بتا
ہم تری یاد میں اب کتنا بکھرتے جائیں

اتنا ہی نہیں شاعر کی قربانی بھی مندرجہ ذیل شعر میں دیکھئے ؎

میرا گھر چاہو تو جلا ڈالو
اور روشن تم اپنی راہ کرو

اسی طرح آج کے عہد میں طرزِ نو کو عام کرنے کے لئے بھی شاعر کہتا ہے ؎

پھول نہ پھینکو پتھر پھینکو دل کا شیشہ چور کرو
آج کے عہد میں طرزِ نو کا عام کوئی دستور کرو

جدت پسند شاعروں سے متعلق ایک شعر دیکھئے ؎

نئے ادب کے نام پہ کھینچو آڑی ترچھی روز لکیر
نئے نئے الفاظ تراشو خود کو کچھ مشہور کرو

مندرجہ بالا شعر جدت پسند شعرا پر صادق آتا ہے، کیونکہ جدیدیت کے حامی شعرا بے معنی الفاظ، استعارے وتشبیہات سے اشعار مکمل کرتے رہے جو وہ خس وخاشاک کی آندھی میں اُڑ گئے ؎

گفتار کے غازی ہیں، کردار میں عاصی ہیں
کرتے نہیں جو کہتے ہیں شعلہ بیاں والے

مندرجہ بالا شعر اُن مقررین پر ہے جو لچھے دار تقریر کر کے سامعین کو مسحور کر دیتے ہیں، لیکن کیا وہ مقررین ان باتوں پر خود عمل کرتے ہیں ؎

بسا اوقات میدان یقین میں
فرشتوں سے بھی ٹکرایا گیا ہوں

مندرجہ بالا شعر میں پوری تاریخ بیان ہوئی ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔

ناشآد اورنگ آبادی کے مندرجہ بالا مختلف اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں ''آمد'' ہے جو غلطیوں وخامیوں اور کوتاہیوں سے کوسوں دور ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی غزلیہ شاعری پر وقت ضرورت محنت شاقہ اور دماغ سوزی سے کام لیا ہے۔ ناشآد صاحب کے خیالات کی پرواز دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شعر و ادب میں ایک اعلیٰ مقام کے مستحق ہیں۔ ان کی شاعری سادہ الفاظ سے مزین ہے جسے عام لوگ بھی بآسانی سمجھ جاتے ہیں۔ ناشآد صاحب کو ہندوستان گیر پیمانہ پر اردو دنیا کے ہر مکتبہ فکر کے لوگ بخوبی جانتے اور ان کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کی اپنی انفرادیت صاف جھلکتی ہے جو پڑھنے اور پرکھنے کی دعوت دیتی ہے۔ وہ اپنی غزلوں سے محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

ہم تو ہیں غزل گو ہمیں رغبت ہے غزل سے
غزلوں کا کسی بزم میں سودا نہیں کرتے

ناشآد صاحب کی ایک طویل غزل جس کا عنوان ''تاریخ کے آئینے میں'' ہے، اُس غزل کو میں ذاتی طور پر اگر نظم نما غزل کہوں تو کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس طویل غزل میں جس طرح تاریخ اردو بیان کی گئی ہے، وہ لائق تحسین ہے، اس کی تعریف نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ اسی طرح ان کی ایک طویل غزل ''تاریخی غزل'' کے عنوان سے بھی ہے جس میں اردو زبان کی نشونما میں ادبا وشعرا کی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں طویل غزلیں اردو شعر وادب کے ذہین نقادوں وقارئین کو متوجہ کرتی ہیں۔ ان دونوں نظم نما طویل غزل پر ایک مکمل مضمون تحریر کرنے کی ضرورت ہے۔

ناشآد اورنگ آبادی کی چند نظمیں میرے سامنے ہیں ''قومی یکجہتی'' اور ''قومی ایکتا'' کے عنوان سے انہوں نے اتحاد کے بارے میں بڑے اچھے انداز سے قوم کو مخاطب کیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ اگر ہم سب متحد ہو جائیں تو دنیا کا کوئی بھی ملک ہم سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح ''قومی ترانہ'' نظم میں بھی ناشآد صاحب نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ نظم ایک تاریخ بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ''کرفیو'' نظم میں کرفیو کسی شہر میں لگنے کے بعد کن کن مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے، اسے بیان کیا گیا ہے۔ ''دیوالی کے دیپ'' نظم میں دیوالی کی چہل پہل اور رنگ برنگ قمقے کی جگہ آہ وبکا کیوں ہے، اس کے متعلق شاعر نے بیان کیا ہے۔ ''اردو'' نظم میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی پھر بھی یہ نظم ایک سبق ضرور دیتی ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مجموعی طور پر ناشآد اورنگ آبادی نظموں کے شاعر نہیں ہیں بلکہ یہ غزلوں کے شاعر ہیں۔ انہوں نے غزل کے اشعار سے آج کے انسان کو خبر دار کیا ہے۔ حسن وعشق کی بات بھی کیا ہے اور بہت سارے مسائل سے متعلق انہوں نے اپنی بات اشعار کے ذریعہ پیش بھی کیا ہے۔

ناشآد اورنگ آبادی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اشعار میں عربی فارسی کے ادق الفاظ نہیں ملتے بلکہ ان کے اشعار عام فہم زبان، آسان الفاظ، اور روزمرہ کے زبانوں سے مزین ہوتے ہیں۔ ناشآد صاحب کے یہاں زبان کی سلاست کے ساتھ جمالیاتی حسن ونکھار بھی ہے۔ سادگی، رعایت لفظی، اسلوبیاتی جدت نے ان کی غزلیہ شاعری کو ایک منفرد انداز عطا کیا ہے۔ ❁❁

ڈاکٹر ایم۔عارف

Kali Bagh, Bettiah - 845438 (West Champaran) (Mob. 7250283933)

ایم عالم: حیات اور عمومی خدمات

بتیا شہر کے ممتاز ترین مسلم خاندانوں میں ایم عالم کا خاندان ایک اہم اور منفرد خاندان کی حیثیت سے معروف تھا۔ بزرگ لینڈ لارڈ کہے جاتے تھے، پھر وہ دن بھی آیا کہ حکومت نے لینڈ لے لی، لیکن اولاد مزاجاً لارڈ ہی رہی۔ گھر کا ماحول دینی تھا، سبھی نماز روزہ کے پابند تھے، دینداری نمائشی نہیں بلکہ فطرت میں شامل تھی۔ نیکی کرنے کے پیچھے یہ تصور نہیں تھا کہ لوگ ہمیں نیک سمجھیں اور کہیں، بلکہ اس میں حکم الٰہی کو ماننے کا صالح انداز تھا۔ بزرگ غریب پرور تھے۔ دستر خوان وسیع اور کھلا ہوتا تھا۔ صبح ناشتے میں لگ بھگ تمام پڑوسی شامل رہتے تھے۔ محلّہ کے بچوں کا کیا کہنا جیسے یہ ان ہی کا گھر ہو۔ بڑے بزرگ پورے محلے کے دادا، نانا، چچا اور بھیا تھے۔ خواتین دادی، نانی، چاچی، پھوپھی اور بھابھی تھیں۔

گھر کے سامنے کھلے میدان میں نیم اور جامن کے درخت تھے۔ ان کے نیچے چبوترہ بنا ہوا تھا۔ رمضان کے دنوں میں گھر کے مرد اُسی چبوترہ پر افطار کرتے۔ پڑوسی ہی نہیں محلے کے لوگ بھی شامل ہوتے۔ افطار کے بعد وہیں مغرب کی نماز باجماعت ادا ہوتی۔

یہاں تعلیم و تعلم سے اس قدر شغف تھا کہ لوگ عام دنوں میں دالان میں جمع ہوتے اور مختلف فنون کی کتابیں، اخلاقی داستان اور کہانیاں وغیرہ پڑھ کر سنائی جاتیں اور لوگ غور سے سنتے۔ خدمت گار پنکھا جھلتا۔ اختتام کے بعد پڑھنے والے کو محنتانہ کے طور پر انعام سے نوازا جاتا۔ ایسے ماحول میں پلنے والے ایم عالم کی پیدائش ۲ رنومبر ۱۹۳۱ء کو سوموار کے دن ایک زمیندار، دیندار، تعلیم یافتہ اور معزز گھرانے میں ہوئی جسے محلّہ والے ''بڑکا گھر'' اور ''بڑکا آنگن'' کے نام سے پکارتے تھے۔

ایم عالم کا بچپن بڑے ناز و نعم میں گزرا۔ خوش حالی نے پروان چڑھایا، مگر رئیسانہ زندگی اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ کے باوجود مزاج درویشانہ ہی تھا۔ بہت خوش حال اور پرسکون زندگی گزر رہی تھی، لیکن وقت کا پہیا بھی گردش میں تھا، زیادہ دنوں تک یہ بات نہیں رہی۔ والدمحترم الحاج محمود عالم کا سایہ سر سے اٹھا اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ پر تاریکیوں کے سائے منڈلانے لگے۔

عمل پیہم، سعی مسلسل اور ناموافق حالات سے لڑنے کی عادت ایم عالم کی فطرت میں شامل تھی۔ انہوں نے زمینداری ختم ہونے کا کبھی بھی رونا نہیں رویا اور نہ ''پدرم سلطان بود'' کی تسبیح پڑھا، بلکہ جدوجہد جاری رکھا۔ فکر معاش نے کئی جگہوں کا سفر بھی کرایا۔ جہاں بھی رہے، درس و تدریس کے پیشے سے جڑے رہے، مگر پیشہ ور معلم نہیں بنے بلکہ خدمت خلق، خدمت دین وملت اور انسانی فلاح و بہبود کے جذبہ میں ڈوب کر درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔

ایم عالم نے روحانی سکون اور قلبی اطمینان کے لیے نیز کار خیر سمجھ کر اس پیشہ کو اختیار کیا تھا۔ نوکری کی تلاش میں آسنسول گئے۔ وہاں ان کے دوست منصور انجم ایک اسکول کے مدرس تھے۔ ایم عالم بھی وہیں استاد کی حیثیت سے بحال ہوگئے اور تدریسی خدمت انجام دینے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ''ربانیہ ہائی اسکول'' میں معلم ہوگئے۔ چند مخلص دوستوں کے اصرار پر وہ آسنسول کے مشہور تعلیمی ادارہ ''دانش گاہ'' سے بحیثیت معلم منسلک ہوئے۔ اسی درمیان قیام انیس سے دوستی ہوگئی اور ایم عالم کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔

قیام انیس نے آسنسول سے ہفتہ وار اخبار ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' نکالنا شروع کیا تو ان کے مسلسل اصرار کے بعد ایم عالم اس اخبار کے مستقل کالم نگار ہوگئے۔ بعد میں قیام انیس نے ''محرک'' کی اشاعت شروع کی۔ ایم۔ عالم اس کے بھی مستقل کالم نگار ہوگئے۔ ان کے متعدد افسانے، مضامین اور مقالے اشاعت پذیر ہوئے۔ وہاں کی زندگی بڑی خوشگوار رہی۔

ایم عالم جب بھی آسنسول کا ذکر کرتے تو اپنے کارناموں نیز اپنے دوست واحباب اور شاگردوں کی باتیں کرتے اور خاص طور سے شمس ندیم، عابد ضمیر، مشتاق اعظمی، نعیم اشفاق، قیام انیس، منصور انجم، مجیب الرحمٰن کوثر وغیرہ کا نام خوب مزے سے لیا کرتے اور آسنسول کی ادبی چشمک اور قلم کاروں کی آپسی نوک جھونک کا ذکر کرتے وقت ماضی کی یادوں میں کھو جاتے تھے۔

وقت کا پہیا رکتا نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ہر آن تبدیلیاں بھی واقع ہوتی ہیں۔ آسنسول کی ملازمت، یاردوستوں کی رفاقت اور محفلوں کو چھوڑ کر شمالی بہار کے مردم خیز خطہ ارض اور اپنی جنم بھومی بتیا کو انہوں نے اپنی کرم بھومی بنالیا۔ان کے دیرینہ دوست محمد ابراہیم صاحب ''درس گاہ اصلاحی'' بتیا میں معلم تھے اور ''درس گاہ اصلاحی'' کو ایک مثالی تعلیمی ادارہ بنانے کے متمنی تھے۔اس کام میں تعاون کے لیے انہوں نے ایم عالم سے درخواست کی اور پھر وہ ''درس گاہ اصلاحی'' میں بحیثیت معلم مقرر ہوئے اور تادیر اپنے فرائض کو انجام دیتے رہے۔اسی اثنا میں بتیا کے ایم، این، ایم ویمنس کالج کے شعبہ اردو میں بحیثیت لکچرر ان کی تقرری ہوگئی، بعد میں وہ صدر شعبہ بھی ہوئے۔

ایم عالم کو مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔لکھنے کا شوق بھی بہت پرانا تھا۔ان کی پہلی تخلیق ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ایم ایس کالج موتیہاری کے کالج میگزین میں ان کا مقالہ بعنوان ''میں کیا پڑھوں؟'' اشاعت پذیر ہوا تھا۔انگریزی میں پہلا مضمون "My first experience of college" شائع ہوا۔اس کے بعد کاغذ، قلم اور کتاب کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا اور افسانہ، انشائیہ، مضمون، مقالہ، انٹرویو، شخصی خاکہ، پیش لفظ، محفلوں کی روداد اور تبصرہ خوب خوب لکھا۔انگریزی ادب سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ان کی صرف شائع شدہ تخلیقات کو کتابی شکل دی جائے تو دونوں ہاتھ کی انگلیاں دو بار بھی شمار کے لیے کم ثابت ہوں گی۔

ایم عالم کو جس طرح پڑھنے میں کسی صنف اور موضوع کی قید نہیں تھی، اسی طرح لکھنے میں بھی کسی صنف اور موضوع کی قید نہیں رہی۔ ہمہ جہت، کثیر اور وسیع مطالعہ کے سبب ہر موضوع پر خامہ فرسائی کے لیے ان کے پاس ہمہ وقت بھرپور مواد رہتا۔معاشرے میں تبدیلیاں آئیں، فکر ونظر میں انقلابات رونما ہوئے، ملکی حالات بدلے، سیاست دانوں کے خیالات بدلے، ارباب حکومت کا نظریہ بدلا اور ادب کا سانچہ بھی بدلا، انہوں نے ہر موضوع پر خوب لکھا۔کسی ایک صنف نثر کو اپنی جولان گاہ نہیں بنائی، بلکہ نثر کی تقریباً ہر مقبول صنف میں انہوں نے اپنی فکر اور فن کا اظہار کیا۔آخر میں مقالہ نگاری اور مضمون نگاری کو اپنے افکار واحساسات اور تجربات ومشاہدات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔اخبار سے لے کر جریدہ تک میں لکھنے ریڈیو سے لے کر سمینار تک میں شرکت کے دعوت نامے آئے۔ رسائل کے خاص نمبر کے لیے مضامین اور مقالات کی فرمائش بھی کی گئی۔ ریسرچ اسکالروں کے سوال نامے بھی موصول ہوئے۔تعریفی خطوط بھی آئے، مگر ہمیشہ خط کو انہوں نے خط ہی سمجھا۔انہیں سند یا سرٹیفکیٹ کا مقام نہیں دیا اور دستاویز بنا کر فائل میں نہیں رکھا۔ایک زمانہ تھا کہ موصوف طویل مقالے اور مضامین لکھا کرتے تھے جو کئی قسطوں میں اشاعت پاتے تھے اور کچھ رسالوں کے مدیر حضرات مقالوں اور مضامین کی طوالت کے پیش نظر یہ لکھنے پر مجبور ہوجاتے تھے کہ:

> ''مضمون لکھنے میں آپ نے واقعی محنت کی ہے، لیکن رسالہ کے محدود صفحات اس کی طوالت کے متحمل نہیں ہوسکتے۔اس کے لیے کم ازکم ۳۰ صفحات ہونے چاہئے، پھر بھی کوشش کروں گا کہ دو قسطوں میں اسے دے دوں۔دیکھئے کیا صورت نکلتی ہے؟''

کوئی یہ لکھتا کہ:

> ''آپ کا مضمون بہت اچھا ہے، لیکن میرے رسالے کے کل صفحات کا نصف یہی لے لے گا۔''

اس کے بعد یہ تبدیلی آئی کہ مختصر لکھنے لگے۔ایم عالم کی نگارشات کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ملی مسائل ہوں یا قومی، گھریلو پریشانی ہو یا ملکی، تعلیمی حالات ہوں یا ادبی، معاشی معاملات یا معاشرتی زندگی کے تقاضے ہوں یا اقتدار کے حصول کے لیے ذات پات کا تنازع یا انفرادی و اجتماعی زندگی کی الجھنیں، خاندانی نظام کی مشنری ہو یا کسی خاص رخ پر حکومت کی مجرمانہ غفلت، جمہوری قدروں کی پامالی ہو یا روز افزوں بے روزگاری کا مسئلہ، تعلیمی پسماندگی ہو یا جہالت، ذات پات کی تفریق ہو

یا چھوا چھوت کی نفرت، کرپشن، مہنگائی، جرم، غربت، فرقہ واریت، اخلاقی زوال، سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانی، رشوت خوری، ملاوٹ یا جبر و استحصال غرض ہر موضوع پر انہوں نے اپنے افکار کا بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ ان کے مضامین ان کی ضمیر کی آواز ہیں، وقت کی پکار ہیں، ان کی تخلیقات پوری انسانیت سے وابستہ ہیں۔ انسانی قدروں کا احترام ان کی تخلیق میں بہ درجہ اتم موجود ہے۔

ایم عالم کے ادبی و شخصی مضامین اور مقالے ہر ازم سے الگ ہیں۔ ان کے مقالات موجودہ عہد کے مروجہ ادبی رجحانات اور میلانات سے قطع نظر خالص ادبی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کا عطر کہلا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدما کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے وقت وہ ان کی خامیوں کی تلاش نہیں کرتے، بلکہ ان کے موضوعات، فنکارانہ اظہار اور معاشرہ کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی خوبیوں کو سراہتے ہیں اور ان کی ادبی کاوشوں کا اعتراف کرتے چلے جاتے ہیں۔

ایم عالم کا وصف تحریر یہ تھا کہ وہ ہر ادب پارہ میں خوبیوں کے متلاشی رہتے تھے۔ عصر حاضر کی یہ عام روش ہے کہ لوگ خوبیوں میں بھی خامیاں ڈھونڈ تے ہیں، لیکن ایم عالم اس کے برعکس خامیوں میں بھی خوبیاں نکال لیتے تھے۔ بطور تبرک ادبی مضامین اور شخصی مقالوں کے چند عنوانات پیش ہیں:

''شاعری ذات کے اظہار کا آئینہ ہے''، ''ادب اور انقلاب''، ''اردو افسانہ نویسی کا ارتقا''، ''اردو ہماری مادری زبان ہے''، ''فن افسانہ نگاری''، ''بہار میں اردو افسانہ نگاری''، ''زمین زندگی کی شاعری ہے''، ''زندگی اور شاعری''، ''طنز ومزاح کے جھروکے سے''، ''مشاعرے اور طرحی مشاعرے''، ''اردو اور جنگ آزادی''، ''اردو ادب کا ایک درخشندہ کہانی کار: راجندر سنگھ بیدی''، ''عالم طنزیات کا قطب مینار: فکر تونسوی''، ''خوشتر گرامی: ایک جائزہ''، ''منٹو اور عورت''، ''سہیل عظیم آبادی: بہاری پریم چند''، ''قاضی عبدالودود قلمکاروں کی نظر میں''، ''اختر انصاری ایک مطالعہ''، ''اوپندر ناتھ اشک کی افسانہ نویسی''، ''شکیلہ اختر: اپنی کہانی آنکھ مچولی کے آئینے میں''، ''علی سردار جعفری: ایک منفرد ادیب وشاعر''، ''نظیر: محبوب عوامی شاعر''، ''جوش کی انقلابی شاعری''، ''اختر الایمان کی شاعری''، ''مرحوم شین مظفر پوری: ظلم کا پہیہ کے آئینے میں''، ''محمد محسن: انوکھی مسکراہٹ کے جھروکے سے''، ''اقبال کا نظریۂ حیات''، ''خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر''، ''چچا غالب کی شخصیت اور ادبی حیثیت''

ایم عالم نے ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ سیاست اور سیاسی شخصیات پر بھی متعدد مضامین لکھا ہے مثلاً:

''ہم کدھر جا رہے ہیں''، ''یہ پیش خیمہ ہے نئے انقلاب کا''، ''ابھی منظر بدلا نہیں ہے''، ''اے کاش قوم جانتی''، ''ملک کی تعمیر نو''، ''مذہبی تعصب سے نجات دلانے کے لئے ایک مجرب نسخہ''، ''قومی یک جہتی ایک مقدس دیوی کے روپ میں''، ''سحر کا بھیس بنا کر بھی رات، رات رہی''، ''مذہب اور فرقہ پرستی: لمحہ فکریہ''، ''اجلے دامن کالے دھبے''، ''امن کی بقا کے لئے جنگ کی تیاری لازمی ہے''، ''آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو: طفلان ہند کے کردار کے عظیم معمار''، ''بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی''، ''مہاراجہ رنجیت سنگھ: حیات اور تاریخ ساز کارنامہ''، ''مولانا آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت'' وغیرہ۔

اسی طرح ایم عالم کے یہاں سماجی اور معاشرتی مضامین کا بھی ایک جہاں شاد وآباد ہے مثلاً:

''ازدواجی تعلقات کی خوشگوار بنیادیں''، ''معاش اور معاشرہ''، ''گردش ایام''، ''نوجوانوں کی اصلاح کا ذمہ دار کون ہے؟''، ''اے عورت تیرا کون سا روپ سہانا''، ''آؤ ہم سب نیا سماج بنائیں''، ''جہیز معاشرے کا سنگین ترین جرم''، ''موجودہ حالات اور ہماری ذمہ داری''، ''تشکیل معاشرہ کے لئے تعمیر فکر وفن ناگزیر''، ''طالب علم اور جدید ہندوستان''، ''یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے

براتونے‘‘،’’ہم اپنے کرتوت سے ہندوستان کے مستقبل کو
تاریک کرتے جارہے ہیں‘‘،’’اے نقیب راستی جب سے
توجداہوا‘‘وغیرہ

ایم عالم نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی اور اس کے اُتار چڑھاؤ نیز تلخ وشیریں مسائل کو بخوبی پیش کیا ہے۔ان کا مطمح نظر تعمیری ہے۔ تخلیق افسانہ میں ہمہ وقت یہ مقصد پیش نظر رہا ہے کہ معاشرہ میں پنپنے والے غلط رجحانات،قدروں کی شکست وریخت،بدعنوانی،بے ترتیبی، کوتاہی اور خرابی صفحۂ قرطاس پر اس طرح تحریر ہو کہ قوم وملت اور معاشرہ کے لیے مفید ثابت ہو۔ان کی افسانہ نگاری تفریحی نہیں،مقصدی ہے، لیکن ان کے یہاں فنی اقدار اور افکار کی ترسیل پر مقصدیت حاوی نہیں ہوتی ہے۔وہ افادیت کے قائل ضرور ہیں،لیکن ادب میں جمالیاتی اقدار کی اہمیت کے منکر بھی نہیں ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں میں مخصوص نوعیت کی حقیقت پسندی پائی جاتی ہے،جسے پریم چند اسکول کی واقعاتی افسانہ نگاری کی حقیقت نگاری سے الگ،ترقی پسند ادبی تحریک کی حقیقت نگاری سے علیحدہ اور اختر انصاری کی تاثراتی حقیقت نگاری سے جدا ایک منفرد حقیقت نگاری سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ان کے افسانے ’’سمجھوتہ‘‘،’’گوپی‘‘،’’اشکوں کے موتی‘‘،’’فریاد گھٹی گھٹی سی‘‘،’’پناہوں کے گھیرے میں‘‘،’’کہانی ادھوری ادھوری سی‘‘،’’فرض کی قربان گاہ پر‘‘، ’’نیا راستہ نئی منزل‘‘،’’عشق از بام برزمین آید‘‘،’’سلگتے آنسو‘‘،’’ادھوری چھٹی‘‘،’’کھنکھناتی چوڑیاں‘‘وغیرہ خاص طور سے لائق مطالعہ ہیں۔

ایم عالم کے انشائیوں میں حکومت،معاشرہ اور حیاتِ انسانی کی کم مائیگیوں،کوتاہیوں،ناہمواریوں اور کمزور پہلوؤں پر بھرپور ضرب لگائی گئی ہے۔ان کے انشائیوں میں طنز ومزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ کہیں واقعات کے بیان سے،کہیں منظر کشی سے اور کہیں صرف ایک یا دو جملے سے انہوں نے طنز کا کاری وار کیا ہے۔ پردہ کا جس انداز سے ہمارے یہاں رواج ہے،لاوارث مردوں کی تجہیز وتکفین کے لیے فنڈ جمع کرنے کا جو طریقہ ہے،بہو تلاش کرنے کا جو جدید طرز ہے۔آنریری (Honorary) پروفیسر کا جو حال ہے،ہمارے رہنماؤں کا جو کردار ہے اور موجودہ دور میں کسی رسالہ کے ایڈیٹر کی جو روش ہے،اس پر انہوں نے اپنے انشائیوں میں بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ان کی نگارشات میں طنز کی نشتریت دماغ کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتی ہے۔’’میں اپنے شوہر کی بیوی ہوں‘‘،’’چچا چھکن کا حق رائے دہندگی‘‘،’’میں آنریری پروفیسر ہوں‘‘،’’میں ایک شاعر ہوں‘‘،’’میں ایک شوہر ہوں‘‘،’’بے چاری بہو جی‘‘،’’جنت میں اقلیتی کانفرنس‘‘،’’آباد ویران‘‘،’’میں ایک شاندار اور ایماندار نیتا ہوں‘‘،’’میں ایک ایڈیٹر ہوں‘‘،’’پردہ‘‘،’’لکھنا میرا مضمون کا بنانا پڑا بیگم کا‘‘،’’لاوارث فنڈ‘‘،’’الیکشن نامہ‘‘،’’کردار کی واپسی‘‘وغیرہ ان کے قابل ذکر اور نہایت پرلطف انشائیے ہیں۔

بچوں کے لیے لکھنا آسان کام نہیں،مگر ایم عالم نے اس میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور بچوں کی ذاتی تعمیر کے بنیادی عوامل کو اجاگر کرنے کے لیے پوری محنت کی ہے۔وہ اس احساس سے معمور تھے کہ آج کے بچے کل کے شہری ہیں،وہ ملک کے مستقبل کے معمار ہیں،آئندہ وہ جیسے ہوں گے ہمارا معاشرہ اور ملک بھی ویسا ہی ہوگا،چنانچہ انہوں نے بچوں کے گفتار و کردار کی تعمیر اور شخصیت کی تشکیل کی غرض سے متعدد مضامین لکھا،کہانیاں لکھیں اور انگریزی کہانیوں کا ترجمہ اردو میں پیش کیا جو نہایت سبق آموز اور نصیحت آموز ہے۔اس حوالے سے’’دنیا کے لالچی لوگ‘‘،’’بچے کیوں جھوٹ بولتے ہیں‘‘، ’’پھیری والا جن‘‘،’’آج کے بچے کل کے شہری‘‘،’’بچوں کے چاچا نہرو‘‘،’’بچے اور دروغ گوئی‘‘وغیرہ جیسے مضامین یقیناً بچوں کے ادب میں ایم عالم کے قلم کا کامیاب تحفہ کہلا سکتے ہیں۔

ایم عالم انگریزی ادب سے ترجمہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔’’عقل مند غلام‘‘،’’عقل مند کسان‘‘،’’شہزادی شہناز‘‘،’’شیر اور اونٹ‘‘،’’سونے کا تھیلا‘‘،’’نیک دل کا پھل‘‘،’’شہزادی بلقیس‘‘، ’’ایک راجہ اور ایک معمار‘‘وغیرہ ان کے تراجم کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اتنا ہی نہیں ایم عالم نے بعض کتابوں پر بہت عمدہ تبصرے بھی لکھا ہے۔ ’’عظیم اقبال کا افسانوی مجموعہ:جو کہا نہیں جاتا‘‘،’’چند لمحے شمس ندیم کے ’قیدی‘ کے ساتھ‘‘،’’نشانہ‘‘۱۹۸۸ کی بہترین مختصر کہانی‘‘،’’عظیم اقبال: حرف حرف داستان کے جھروکے سے‘‘،’’نگارستان ایک مطالعہ‘‘، ’’ظ۔انصاری اور خسرو کا ذہنی سفر‘‘،’’زیر لب:ایک جائزہ‘‘،’’ظلم کا پہیہ‘‘

وغیرہ ان کی تبصراتی تحریروں کے عمدہ نمونے ہیں۔

ایم عالم نے زندگی کے ہر موضوع کو اور سماج و معاشرے کے تمام مسائل کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔اس طرح ان کے نثر پارے سماج کا مکمل احاطہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جو اپنی تمام تر لفظی ترکیبوں اور فنی تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے پیش کئے گئے ہیں۔

ایم عالم وہ نام ہے جس نے چمپارن کے گمنام مجاہدین آزادی نیز شعرا وادبا کو اپنی تحریر سے جاوداں بنا دیا، جب کہ یہاں اچھے اچھوں کو فراموش کر دینے کا چلن عام ہے۔اپنے شہر کی نئی نسل ہو یا قدیم، مردے ہوں یا زندے، جیتے جی ادبی موت مر چکے ہوں یا ادبی سرگرمیوں میں سرگرم ہوں یا گمنام اور بے نام ہو چکے ہوں، بہر حال ایم عالم نے سبھی کو اردو ادب کے لئے جواہر سمجھا اور ایک جوہری کی طرح ان کو اپنی تحریر میں پیش کیا ہے۔

ایم عالم کی تحریروں کا یہ پہلو خاص طور سے لائق ذکر ہے کہ انہوں نے چمپارن کے فنکاروں کو اپنے مضمون کے ذریعہ ہمیشہ اونچا اٹھانے کی کوشش کی۔چمپارن کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا اور ادبی دنیا کو بتیا کی ادبی سرگرمیوں سے متعارف کراتے رہے۔کبھی ناظم بھارتی کو باغ و بہار شخصیت تو کبھی عظیم اقبال کو افسانوی انسان، کبھی حسرت شادانی کو ایک شاعر انسان تو کبھی اشرف قادری کو صبح اشرف، دوپہر اشرف اور شام اشرف قرار دیا۔کبھی شیدا یزدانی کو گمنامی سے نکالا، تو کبھی ساحر بتیاوی کو۔کبھی علم و ادب کے آکاش کے گہنائے سورج عبدالغنی ندوی کے کارناموں سے عوام الناس کو متعارف کرایا تو کبھی مرزا غنی کھونچ بتیاوی کو ایک طنزیہ اور مزاحیہ فنکار گردانا۔کبھی مولانا عبدالحکیم ارمان کی شاعرانہ فنکاری سے زمانہ کو آگاہ کیا۔کبھی شیخ گلاب کو چمپارن کا گلاب بنایا تو کبھی پیر علی مونس اور دیگر مجاہدین آزادی پر مضامین لکھ کر ہندوستان کی جنگ آزادی میں چمپارن کے مقام کو واضح کیا۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ایم عالم یقیناً اپنے طرز و مزاج کے پہلے مضمون نگار ہیں، جنھوں نے بتیا کی گمنام شخصیات پر قلم اٹھایا اور قبر سے نکال کر انہیں اوراق پر لایا ہے۔

ایم عالم نے چمپارن کی ادبی فضا اور ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کبھی ''مغربی چمپارن مردم خیز اور مردم مار علاقہ'' تو کبھی ''بتیا جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب'' کبھی ''بتیا کی شعری نشست'' تو کبھی ''بتیا کی ایک مخصوص یادگار ادبی نشست'' اور کبھی '' لکھتے لکھتے تھک گئیں دست ہنر کی انگلیاں'' جیسی رپورٹ لکھ کر نئے فنکاروں کی پذیرائی کی، ان کا حوصلہ بڑھایا، ان میں خود اعتمادی پیدا کی اور ان سے بہت ساری امیدوں کی وابستگی کا اظہار کیا، یہاں تک کہ ان میں کئی آج علم و ادب کا درخشندہ ستارے بن کر ادبی دنیا میں چمک رہے ہیں۔

ایم عالم نے جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا، اپنے بزرگوں کی ادبی میراث کو محفوظ رکھنے کے لئے مضمون کو مناسب ذریعہ سمجھا۔اپنے شہر کے بزرگوں کے ادبی کارناموں کو سنبھال کر رکھا اور ادب کی دنیا میں گمنام شاعروں اور ادیبوں کو نئی زندگی دے کر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کیا۔ایم عالم کے افسانے ہوں یا مضامین، انشائیے ہوں یا بچوں کا ادب، مقالہ ہو یا تبصرہ یا رپوٹ ہر جگہ ان میں شخصیات شناسی کا جذبہ اور موجودہ صورت حال کا تجزیہ ملتا ہے۔انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ ملک وملت کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی ہے اور بڑے ہی فنکارانہ انداز میں سماجی و معاشی حالات کو اپنی تخلیقات میں اجاگر کیا ہے۔ان کا ادب، ادب برائے ادب نہیں، ادب برائے تفریح بھی نہیں بلکہ ادب برائے زندگی اور ادب برائے اصلاح ہے۔انہوں نے چونکہ بنیادی طور پر اسلامی فکر و نظر میں ڈوب کر قلم اٹھایا ہے، لہٰذا ہر جگہ ان کا نصب العین تعمیری اور اصلاحی رہا ہے۔ان کی تحریریں ان کی آوازیں ہیں، دل کے نگار خانے ہیں اور روزانہ کے تجربات و مشاہدات کی موثر تصویریں ہیں۔

ایم عالم نے اپنے ادب میں زندگی کے ہر رخ پر روشنی ڈالی ہے۔زندگی کے ہر معمہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور خود دنیا کو سمجھ کر دنیا کو سمجھانا چاہا ہے۔دین کی خدمت کا جذبہ ہو یا وطن عزیز سے محبت بیدار کرنے کی کوشش، فکر آخرت کا خوف ہو یا انسانیت کی خدمت، طلبہ میں اخلاق کا معیار ہو یا آپسی محبت، رواداری، ایثار و قربانی کا جذبہ، ہر موضوع کے تعلق سے انہوں نے بروقت رہنمائی کی اور بتایا کہ معاشرے میں ترقی، خوش حالی، امن و امان اور سکون اس وقت تک میسر نہیں ہوگا جب تک

(بقیہ ص ۲۵ پر)

عبدالرزاق رضوی
Gulzarbagh, Patna City, Patna - 800007

کلیم الدین احمد اوران کی تنقید نگاری

لفظ تنقید ہمارے لئے ایک جانا پہچانا لفظ ہے جسے عربی مادہ ’’نقد‘‘ اور مصدر ’’انتقاد‘‘ سے تفعیل کے وزن پر اردو والوں نے اختیار کرلیا ہے۔ یہ لفظ ادبی اصطلاح کے طور پر ایک طرف کسی ادب پارے کی خوبی اور خرابی بتانے کا معنی دیتا ہے اور تحسین و تنقیص سے الگ اپنا ایک مفہوم رکھتا ہے تو دوسری طرف اس سے تنقید کے اصول وضوابط قائم کرنے، اصناف ادب کی تعریف و شناخت سے بحث و مباحثہ کرنے، تنقیدی تحریروں کے محاسن و معائب بتانے، فلسفہ اور دیگر علوم کے حوالے سے نقد ادب کی جہتیں ڈھونڈنے اور تاریخ تنقید سے بحث و تمحیص کرنے کے معنی بھی ملتے ہیں۔

تنقید اور خصوصاً ادبی تنقید کا فن بجائے خود بہت ہی عمیق و متین اور انتہائی شاندار فن ہے، جس کے بارے میں عبادت بریلوی نے اپنی کتاب ’’اردو تنقید کا ارتقا‘‘ میں لکھا ہے کہ اس کی ابتدا دور قدیم میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں طنزیہ داد کے عمل سے ہوئی۔ کچھ تذکروں میں شعرا پر دی گئی معلوماتی رائے میں بھی تنقید کے عناصر موجود ہیں، البتہ اردو میں ادبی تنقید کی باقاعدہ ابتدا ’’آب حیات‘‘ سے ہوتی ہے۔

محمد حسین آزاد کی اس کتاب کو از روئے تبصرہ، تذکرہ کہا جائے یا تذکرے اور تاریخ کے بیچ کی کڑی، بہر حال اس میں دو رائے نہیں کہ یہ کتاب ایک تاریخی کردار کی مالک ہے، کیوں کہ اس میں پہلی مرتبہ ادب میں تنقیدی شعور ایک فن کے روپ میں سامنے آیا ہے۔ ممکن ہے مذکورہ خیال بحث کی گنجائش سے خالی نہ ہو، مگر اتنی بات بہر صورت طے شدہ ہے کہ ہماری زبان میں تنقید کو بحیثیت ایک فن کے، جملہ معائب ومحاسن کے ساتھ اس تاریخی تغیر نے جنم دیا ہے جسے ہم ۱۸۵۷ء کا انقلاب کہتے ہیں۔

محمد حسین آزاد کی ’’آب حیات‘‘ کے بعد سرسید تحریک کے زیر سایہ تنقیدوں سے جدید تنقید کی ابتدا ہوئی اور حالی کی دو کتابوں یعنی ’’مقدمہ شعروشاعری‘‘ اور ’’یادگار غالب‘‘ سے گویا جدید تنقید کی بنیاد پڑی۔ حالی کی کتاب ’’مقدمہ شعروشاعری‘‘ اگر اردو میں تنقید کی اولین باضابطہ کتاب الاصول کہلاتی ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ مقدمہ حالی کے بعد امداد امام اثر کی ’’کاشف الحقائق‘‘ کو اردو کی پہلی قاموسی تنقیدی کتاب کا مرتبہ حاصل ہے، پھر شبلی کا ’’موازنہ‘‘ اردو میں تقابلی تنقید کی پہلی کتاب کہلانے کا حق دار بنتا ہے۔

یہاں از روئے اختصار درمیان کی کچھ تفصیلوں سے صرف نظر کرتے ہوئے جب ہم پہلی جنگ عظیم کے اختتامی سال میں پہنچتے ہیں تو ہمیں صورت حال کچھ اور بدلی ہوئی ملتی ہے۔ اب تک اس میدان میں صرف وہ ارباب قلم تھے جو آزاد اور حالی کی روایت کو آگے بڑھا رہے تھے اور مغربی اندازِ نقد اختیار کر کے مغربی اصولوں کی روشنی میں اردو ادب کو پرکھنے کا کام انجام دے رہے تھے، لیکن اب وقت کے ساتھ ساتھ وہ اصحابِ نقد ونظر بھی اس میدان میں آگئے تھے جو مغربی ادب سے بلاواسطہ اور خاصی گہری واقفیت رکھتے تھے۔

اس سلسلہ کا سب سے پہلا اہم نام عبدالرحمٰن بجنوری کا ہے جنہوں نے ’’محاسن کلام غالب‘‘ لکھ کر نہ صرف یہ چونکا دینے والا اعلان کیا کہ ’’ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوانِ غالب‘‘ بلکہ مغرب کے بعض بڑے شاعروں سے غالب کا موازنہ بھی کیا اور اردو تنقید میں مغرب شناسی کی یک گونہ طرح ڈالی اور پھر اس کے ذرا

بعد ایک طرف ترقی پسند تحریک و تنقید کے پھلنے پھولنے کا زمانہ آیا اور دوسری طرف عظیم آباد کی سرزمین سے ایک شخص اٹھا جس نے ایک طرف ترقی پسند تحریک کے تمام

تنقید نگاروں کی کاوشوں سے ایرادو برأت کا راستہ اپنایا اور دوسری طرف بجنوری کی روایت کو مغرب شناسی سے آگے بڑھا کر مغرب پرستی کی حدوں میں داخل کر دیا، اُس شخص کو آج ہم اور آپ سبھی پروفیسر کلیم الدین احمد کے نام سے جانتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کا پہلا نام رحیم الدین احمد عرف رحمو تھا جو بعد میں کلیم الدین احمد ہوا۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۵ستمبر ۱۹۰۸ء اور جائے ولادت خواجہ کلاں پٹنہ سیٹی ہے۔ ان کے والد کا نام عظیم الدین احمد اور دادا کا نام سید شاہ واعظ الدین احمد تھا۔ کلیم الدین احمد نے تقریباً ۷۵ سال عمر پائی۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۳ء ان کی تاریخ رحلت اور کرشنا پوری پٹنہ ان کی جائے رحلت ہے۔ ان کی میت کرشنا پوری سے پٹنہ سیٹی لائی گئی جہاں اپنے خواجہ کلاں والے مکان کے بیرونی حصہ میں وہ مدفون ہوئے۔

کیمبرج یونیورسٹی سے دوٹرائی پوس لے کر وطن واپسی اور پٹنہ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر بحالی کے چند سال بعد ۱۹۳۹ء سے کلیم الدین احمد کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا اور ۱۹۷۹ء تک جاری رہا۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''گل نغمہ'' کی اشاعت سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ''اقبال: ایک مطالعہ'' کی اشاعت تک پہنچا، پھر زندگی نے وفا نہ کی، یہاں تک کہ ان کی پانچ کتابیں ''میر انیس''، ''تحلیل نفسی اور ادبی تنقید'' (مترجمہ: پروفیسر ممتاز احمد) ''جامع انگلش اردو ڈکشنری''، ''فرہنگ ادبی اصطلاحات'' اور ''اپنی تلاش'' جلد دوم ان کے رخصت ہو جانے کے بعد شائع ہوئیں۔

کلیم الدین احمد کی کتابیں اردو کے علاوہ انگریزی زباں میں بھی ہیں اور متنوع اصناف ادب سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اصل شہرت اور شناخت ان کی تنقید نگاری ہی سے ہے اور خصوصاً اُن کی تین کتابوں سے جو ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئیں یعنی ''اردو شاعری پر ایک نظر''، ''اردو تنقید پر ایک نظر'' اور ''اردو زبان اور فن داستان گوئی''۔ یہ بات دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ کلیم الدین احمد کی تنقید کا سنہری دور صرف پانچ سالہ دور ہے، لیکن اتنا سنہری اور اتنا شاندار کہ آج تقریباً ۷۵ برس کے فاصلے سے بھی اُس دور کی گونج صاف صاف سنی جارہی ہے اور زبان حال سے بتا رہی ہے کہ وہ اگر ان تینوں کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تب بھی ان کی حیثیت اردو ادب کی تاریخ میں محفوظ رہتی۔ کلیم الدین احمد کی مذکورہ تینوں کتابوں پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے لکھا ہے کہ:

> ''اردو شاعری پر ایک نظر، میں کلیم الدین احمد نے اردو شاعری کی تاریخ، روایات، ارتقائی منازل، سماجی اور تہذیبی ماحول کو پیش نظر رکھے بغیر ایک بے لچک معیار سے اردو شاعری کے مختلف اصناف کے بارے میں دوٹوک فیصلے کر دیے۔ اس نقطہ نظر سے غزل مردود قرار پائی، قصیدہ لفاظی بن گیا، مثنویاں بے ربط قصے معلوم ہونے لگیں اور مـــرثیے غیر حقیقی ماحول کے ترجمان نظر آنے لگے، گویا ہر شاعر بے روح اور بے جان ہوگیا۔ یہی صورت حال ان کی دوسری کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں بھی پیش آئی، کیوں کہ وہ اس مفروضے سے شروع ہوئی تھی کہ اردو تنقید کا وجود ہی نہیں۔ یہاں بھی پروفیسر کلیم الدین احمد اپنے علم اور مطالعہ کی وسعت کے باوجود ایک خیالی اور مثالی دنیا میں تنقید کی جستجو کرتے نظر آتے ہیں، البتہ تیسری کتاب 'فن داستان گوئی' ان کتابوں کے مقابلے میں کم انتہا پسند ہے......کلیم الدین احمد کی نثر اکثر و بیشتر سپاٹ ہے۔ کہیں کہیں طنز نے رنگینی پیدا کر دی ہے۔ بہر حال وہ ایک مخصوص تنقیدی نقطہ نظر کے علمبردار ہیں اور ان کی ہر تحریر غور سے پڑھے جانے کی چیز ہے۔'' (مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۳۲۲)

کلیم الدین احمد کو عموماً بت شکن نقاد اور ان کی تنقید کو سرتاسر منفی تنقید کہا گیا ہے اور مغربی ادب سے ان کی حد درجہ مرعوبیت اور اپنے خاندانی تناظر میں تو ہب پسندی کے مذہبی رویے سے غذا یافتگی کی باتیں بھی آئی ہیں۔ مجاز کے لفظوں میں اردو شاعری اور اردو تنقید پر ان کی نظر ''ترچھی نظر'' ہے۔ مولوی عبدالحق کے نزدیک ان کی تنقید محض ''ایک طرز'' ہے، لیکن ان سب خیالات کے باوجود بہر کیف یہ سچائی ہے کہ کلیم الدین احمد کی کتابوں کے افتتاحی جملے ''غزل نیم وحشی صنف سخن ہے'' اور ''اردو میں

تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔'' آج بھی ایسے ادبی ضرب المثل بنے ہوئے ہیں، جنہیں لاکھ سر کہ جبیں ہو کر سہی، مگر دہرائے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

کلیم صاحب کی تنقید پر اعتراضات اپنی جگہ اور اس سے بھی انکار نہیں کہ تنقیداتِ کلیم پر لکھتے ہوئے بصورت تجزیہ جو نتائج نکالے گئے ہیں وہ بھی بسا اوقات بہت اہم اور بہت لائق غور ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سارے جارحانہ اقتباسات کے دوش بدوش کلیم الدین احمد کے یہاں بعض ایسی باتیں بھی ہیں جو بہت صحیح اور سرتاسر حقیقت پر مبنی ہیں اور ہمیں بار بار بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع دیتی ہیں۔

یہ کلیم الدین احمد کی تنقید کا فیضان ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تنقید کے تعلق سے بعض حقائق برہنہ کر دیے ہیں اور ان کی اشتراکیت نواز توسیع پر یک گونہ لگام لگانے کا ذہن ساز فریضہ انجام دیا ہے اور تاثراتی تنقید کے نام پر بجنوری کے ذریعہ ''دیوان غالبؔ'' کو الہامی کتاب یا یوں کہیں کہ کلاسیکی ادب کو الہامی ادب بتانے کا جو ذہن بننے لگا تھا، اس پر بھی بروقت انہوں نے قدغن لگایا ہے۔

کلیم الدین احمد کی تنقید کے اس پہلو کا بھی اعتراف ضروری ہے کہ اس نے ہمارے ادیبوں کو چونکایا، اپنے کارناموں کا جائزہ لینے کا احساس دلایا اور بزرگانِ ادب کے تذکرے میں عقیدے اور عقیدت کا وہ فرق رکھنا سکھایا جو بجنوری کے قلم سے مجروح ہو چلا تھا اور عہد نو کے تنقیدی مزاج کی تشکیل میں بھی اہم رول ادا کیا۔ یہ کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری کا ایک مثبت پہلو ہے کہ انہوں نے ادبی تنقید اور تحلیل نفسی کا رشتہ بتایا، عملی تنقید کے بارے میں مفید مطلب باتیں سمجھائیں، فن داستان گوئی پر پہلی مرتبہ واضح اظہار خیال کیا، داستان جیسی صنف پر ہمدردانہ تنقید لکھی، تنقید کی زبان کا متنوع جہت سے ایک بلند معیار قائم کیا، اردو تنقید کو متین اور فیصلہ کن کارگزاری اور نظریاتی تصلب پسندی کے درجہ تک پہنچایا۔ اصلاحی سروکار اور ادبی سروکار کا فرق اپنی جگہ اور یہ بات بھی اپنی جگہ کہ تیشۂ کلیم کی ضرب سے حالی کی معلومات بھی بچ نہیں سکی ہے، مگر غور کریں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی تنقید نے بہر صورت اس بنیاد کو منزل کمال تک بلندی عطا کر دی جو اسلوب نقد کے تعلق سے سادگی، وضاحت اور نظریہ نقد میں پیروی مغرب کے طور پر حالی کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔

علمی و نظریاتی اختلافات اپنی جگہ اور کلیم الدین احمد کے تنقیدی رویے پر اعتراضات کی پیہم تکرار کا شوق یا اس کی گوناگوں ضرورت اپنی جگہ، لیکن کلیم الدین احمد کی ادبی تنقید کے وزن و وقار سے کسی بھی حال میں یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بہر حال بیسویں صدی میں ہمارے نقد و ادب کو عظیم آباد کے ایک سپوت کی بدولت ملنے والا وہ عظیم ورثہ ہے جس پر اکیسویں صدی کی صبح و شام اگر تادیر ناز کرتی رہے تو اس میں کچھ بھی تعجب کی بات نہیں۔ ❀❀

ایم عالم: حیات اور عمومی خدمات (ص ۲۲ سے آگے)

ہم سب بہترین سماج کی تشکیل کے لئے متحد و متفق نہ ہوں گے۔ نوجوانوں کی اس ملک میں اہم حصہ داری ہے جب تک نوجوان طبقہ بیدار نہیں ہوگا، اس وقت تک ہم کامیاب اور ملک ترقی یافتہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے جس فنکارانہ انداز میں اصلاح و معاشرہ کے پیش نظر ملک و ملت کو دیکھا، اپنے احساسات و محسوسات انتہائی وخلوص کے ساتھ بے خوف وخطر ہو کر زمانے کے سامنے پیش کیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہم اس سے استفادہ کے لئے مزید آمادہ ہوں، سوچیں اور غور وفکر کریں۔

ایم عالم کی زندگی میں اگرچہ ان کا ایک بھی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا پھر بھی ان کی شہرت، عزت اور مقبولیت غیر معمولی رہی۔ البتہ خود ان کے اندر عمر کی ۸۴ بہاریں دیکھنے کے بعد وہ جوش وخروش نہیں تھا۔ لکھنا بھول چکے تھے، مگر کتب بینی اور اخبار بینی کا سلسلہ جاری تھا۔ پڑھتے پڑھتے آنکھیں دھندلی ہو گئی تھیں۔ لکھتے لکھتے انگلیاں تھک گئی تھیں۔ صحت بھی ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ نتیجتاً قلمی سفر بند ہو چکا تھا۔ آخر کار مورخہ ۱۶ جولائی ۲۰۱۸ء بروز سوموار بعد نماز عشاء وہ ہمارے درمیان سے سدا کے لئے ملک عدم کو کوچ کر گئے۔ انا للہ الخ۔ وہ آج آسودۂ لحد ہیں، لیکن ان کی رحلت کے فوراً بعد منظر عام پر آنے والا ان کے نمائندہ مضامین کا مجموعہ ''ادب عکس حیات''، بہر حال ہمیں بار بار ان کی ادبی حیثیت اور عمومی خدمات کا احساس دلا رہا ہے۔ ❀❀

ڈاکٹر احسان عالم
Moh. Raham Khan, Near Al-Hira Public School, Darbhanga - 846004 (Mob. 9431414808)

شوکت حیات: ایک جینوئن افسانہ نگار

شوکت حیات کا شمار بہار کے نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔۱۹۷۰ء کے افسانہ نگاروں میں شوکت حیات کو منفرد و نمایاں مقام حاصل ہے۔شوکت حیات نے اپنے عہد کے افسانہ نگاروں کے فکری رجحانات اور فنی میلانات سے ہٹ کر اپنی پہچان بنائی۔شوکت حیات اپنے عہداور رجحان کو انامیت کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔انہوں نے انامیت، نامیاتیت، سن ستری، تغیر پسندی، امکانیت پسندی جیسی اصطلاحیں وضع کیا ہے۔وہ خود لکھتے ہیں:

> میں چونکہ سائنس کا آدمی تھا اور اپنے ڈھنگ سے افسانے لکھ رہا تھا سوچنے سمجھنے، برتنے کا تمام میرا افسانوی نظام، فکر، لہجہ، تیور، رویہ، تکنیک، ٹریٹمنٹ اور عندیہ اپنا تھا۔ ہمیں کیا نہیں لکھنا ہے۔یہ اجداد اور بزرگوں سے سیکھا تھا (ان کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے) لیکن ہمیں کیا لکھنا ہے یہ اپنے آپ سے، اپنے عہد، اپنے مشاہدے اور تجربے سے سیکھا۔ میں نے خود کو اور اپنے دوستوں کو ترقی پسندی اور جدیدیت سے مختلف اور نیا سمجھتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ ہمیں برانڈ نہ کیا جائے اور ہم نے خود کو (چونکہ اس وقت کوئی نام ذہن میں نہیں آرہا تھا) انام، انامیت پسند اور بے نام نسل کے افسانہ نگار کہنا شروع کردیا تاکہ ہماری اپنی علیحدہ شناخت قائم ہو۔'' (''میری تھیوری سازی اور میرے افسانے'' گنبد کے کبوتر، ص ۳۵)

شوکت حیات کے افسانوں کا ایک بڑا وصف وہ تصنع ہے جو مقصدی ہے اور اوریجنل بھی۔فنکار کا پختہ شعور ہر جگہ اپنا احساس دلاتا ہے۔ان کے افسانوں میں احتجاج اور خودشناسی کا غالب رجحان ان کا ایک منفرد وصف ہے۔ان کا اپنا مشاہدہ اور تجربہ فطری رنگ واثر لئے ہوئے ہے اور ان کے سبب یعنی منفرد اوصاف کے سبب ان کے افسانے ممتاز مقام کے حامل قرار پاتے ہیں۔شوکت حیات پس پردہ نہیں بلکہ پیش پردہ کے قائل ہیں، لہٰذا وہ نہاں وعیاں کے درمیان توازن و تطابق کی خوبصورت ادا افسانہ کے حوالے کردیتے ہیں۔ان کی یہ خوبصورت ادا ہی ہے جس کی بنیاد پر طویل عبارتوں کے چند نقائص کے باوجود وہ مصلح یا مبلغ بننے سے گریز کے عمل کو راہ دیتے ہیں۔

شوکت حیات کے افسانوں کے موضوعات کو اگر نظر میں رکھیں تو پائیں گے کہ ان کے یہاں اکیسویں صدی کا سماج اپنی تمام تر

صورتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔عالمی تشدد ہو یا تعصب کی علمداری، فرقہ پرستی ہو یا نسل پرستی، دہشت گردی ہو یا عدم مساوات، سماجی اقدار کی شکست و ریخت ہو یا اخلاقی نظام کا زوال، ان سب چیزوں نے شوکت حیات کے افسانوں میں جگہ پائی ہے اور اس طرح جگہ پائی ہے کہ ان سے سماجی و اخلاقی نیز سیاسی و عالمی سطح پر رونما ہونے والے تغیر وتبدل کی تصویریں بنتی چلی گئی ہیں۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اس حوالے سے جن ناموں کو پیش کیا ہے، ان میں شوکت حیات کا نام سرفہرست ہے اور ظاہر ہے ایسا شوکت حیات کے افسانوں کے منفرد اوصاف سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اپنے مضمون ''اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار'' میں لکھتے ہیں:

> ''اکیسویں صدی کے سماج کو ہمارے افسانہ نگاروں نے بحسن وخوبی پیش کیا ہے۔شوکت حیات، بشیر مالیرکوٹلوی، مشرف عالم ذوقی......اور دیگر کے یہاں اکیسویں صدی

کے سماج کا تغیر اور تبدل عمدگی سے موضوع کے سانچے میں ڈھل کر اور فن کی آنچ سے پگھل کر افسانے کی شکل میں سامنے آ گیا ہے۔'' (عالمی اردو مجلّہ ادبی گزٹ، مئوناتھ بھنجن، شمارہ ۶، جنوری ۲۰۱۵ء، ص ۸۴)

شوکت حیات نے اپنے افسانوں میں فنی چابک دستی کا خوب خوب مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے منفرد اوصاف متعدد صورتوں میں منعکس ہوتے ہیں۔ واقعات اور سانحات کی فنکارانہ پیشکش، ماجرا نگاری، پلاٹ اور کردار کی خوبصورتی وخوب سیرتی، باریک بینی اور جزئیات نگاری کا حسن وغیرہ شوکت حیات کے افسانوں کے اوصاف کی انفرادیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ شوکت حیات کے افسانوں کا ایک خاص وصف ان کی انامیت سے تعلق رکھتا ہے جو ان کا اسلوب بھی ہے اور امتیاز بھی۔ انامیت کے تعلق سے خود شوکت حیات نے اپنے مضمون میں تفصیلی بحث کی ہے اور ان کے افسانوں کے پس منظر میں انامیت کی تلاش کی جا سکتی ہے جو خود اپنی جگہ منفرد وصف کی حیثیت رکھتی ہے۔

شوکت حیات کے افسانوں کی ایک اور خوبی جو بہت جگہ نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ شوکت حیات اپنے افسانوں میں بیانیہ طرز اختیار کریں یا قدرے ابہام وعلامت کے پیرائے سے کام لیں، وہ ہر جگہ نئی ادا نئی فضا خلق کر لیتے ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں تمثیلی طرز سے بھی کام لیتے ہیں اور علامتی حوالے سے بھی، بیانیہ کا حسن بھی رکھتے ہیں اور ابہام کی فضا بھی روشن کرتے ہیں۔ یہ باتیں ان کے یہاں فطری انداز وماحول کے سبب اجنبی نہیں ہوتیں بلکہ آس پاس کی دنیا کا احساس کراتی ہیں۔

شوکت حیات کے افسانوں کا غالب وطیرہ احتجاج ومزاحمت سے تشکیل پاتا ہے۔ احتجاج کی لہریں شوکت حیات کے یہاں بہت واضح ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ لہریں اپنے ساتھ خس وخاشاک کو بہا نہیں لے جاتیں بلکہ اسے کنارے کرنے کو اپنا فریضہ تصور کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شوکت حیات کے یہاں احتجاج ایک منفرد صورت اختیار کرتا ہے اور ان کے افسانوں کا امتیازی وصف بھی قرار پاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے اپنے مضمون ''جدید افسانہ اور اشاریت'' میں شوکت حیات کے افسانوں کے احتجاج کی یوں سمت نمائی کی ہے:

''شوکت حیات کے افسانے دراصل عصر حاضر کے انسان کے احتجاج کی آواز ہیں۔ فنکار کا یہ احتجاج اخلاقی بحران، بکھرتی قدروں، طبقاتی کشمکش اور ظلم وجبر کے خلاف ہے۔ زندگی نے وہ رخ اختیار کر رکھا ہے کہ فرد آپ خود کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔'' (ماہنامہ شاعر ممبئی، جلد ۵۳، شمارہ ۴، ۱۹۸۲ء)

ایک اور وصف جو شوکت حیات کے افسانوں میں پایا جاتا ہے وہ ہے مروجہ ادبی رجحانات سے استفادہ کے باوجود ان کے جبر سے گلوخلاصی کی فضا۔ افسانہ نگار ہر طرح کے جبر سے انکار کرتے ہوئے اپنے افسانوں کا فکری وفنی نظام ترتیب دیتا ہے۔ شوکت حیات کا اقرار ہو یا انکار، ایجاب ہو یا انحراف، ہر جگہ ان کا خاص احتجاجی شعور اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ دیوندر اسر اپنے مضمون ''نیا اردو افسانہ: جبر بنام اختیار'' میں شوکت حیات کے افسانوں میں ان امور کا احاطہ اس طرح کرتے ہیں:

''نئے افسانہ نگار شوکت حیات جدیدیت کے خلاف اختیار کی آزاد قوت نمو کے خواہش مند ہیں۔ وہ نہ تو مارکسی جبریت کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی ان کا اعتقاد فرائیڈین جبریت پر ہے۔ یہ انحراف وانکار اب احتجاج اور وارننگ کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔'' (سہ ماہی الفاظ، علی گڑھ، مئی جولائی ۱۹۸۱ء افسانہ نمبر)

شوکت حیات اپنے افسانوں میں یکبارگی اپنے ذہن کی تصویر مکمل کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں متوازن رفتار ہے اور وہ تخلیق جوت کے سہارے شدت تاثیر پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شوکت حیات کے یہاں تخلیقی عمل بوند بوند گاگر بھرنے کا عمل ہے، لہٰذا صبر وثبات کا فطری ماحول ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہاب اشرفی شوکت حیات کے تخلیقی عمل کو جس طرح دیکھتے ہیں اس سے بھی شوکت حیات کے افسانوں کے کئی منفرد اوصاف اجاگر ہوتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''مجھے احساس ہوا کہ وہ اس امر کے قائل ہیں کہ 'برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست' وہ پختہ ذہن کے فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو

ہر طرح سے متوازن بھی ہوتا ہے۔ کہیں کوئی لاتعلق داغ دھبہ نہیں۔ اب جو تصویر سامنے آتی ہے وہ حقیقت واقعہ کا عکس محض نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک ایسی تخلیقی جوت ہوتی ہے جو اس کی شدت کو سرتاسر بڑھا دیتی ہے۔ نتیجے میں افسانہ نگار کی غایت افسانہ بن کر ایک پیکر تخلیق میں ڈھل جاتی ہے۔'' (سہ ماہی استعارہ، دہلی، شمارہ ۱۴، ۱۵، اکتوبر ۲۰۰۲ء، مارچ ۲۰۰۴ء)

فکری سطح پر شوکت حیات کے افسانوں کا ایک نمایاں وصف سماجی شعور سے وابستگی کا فن بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں سماجی شعور کی بالیدگی قدم قدم پر اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے اور ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے سماجی اذہان کے مطالعے تک پہنچتی ہے نیز سماجی ضمیر کے تعاقب میں کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ شوکت حیات کے افسانوں کا یہ نمایاں وصف انہیں بہتوں سے الگ پہچان دیتا ہے اور کئی جہتوں سے اہم بنا کر پیش کرتا ہے۔ فکر و اسلوب کی سطح پر ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان خوشگوار مطابقت شوکت حیات کے افسانوں کا نمایاں وصف ہے۔

شوکت حیات کے افسانوں کی ایک خوبی تسلسل بیان کی فطری رفتار و آہنگ سے نسبت رکھتی ہے۔ افسانے کا آغاز و انجام دونوں فطری تسلسل سے نمو پاتے یا ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس خوبی کے سبب ان کے افسانے خود کار مشین کی طرح حرکت کرتے ہوئے رفتار طے کرتے ہیں۔ ایسا کہیں نہیں لگتا کہ افسانہ کو بڑھانے کے لئے دھکا دیا جا رہا ہو یا چبا چبا کر باتیں کرنے کی مصنوعی روش اختیار کی جا رہی ہو۔ ان امور کا ذکر ممتاز و منفرد افسانہ نگار جوگندر پال افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' کے فلیپ پر اس طرح کرتے ہیں:

''شوکت حیات کی واضح تر خوبی بھی اسی امر میں مضمر ہے کہ اس کی کہانی بھی اپنے پاؤں خود آپ چل چل کر عین اختتامیہ پر آ پہنچتی ہے۔ مانو کہانی نے اپنے آپ کو عین بہ عین پورا کر دیا ہو، اب جو کہنا سننا ہے قاری آپ ہی سمجھ سمجھالے۔'' (فلیپ اول، گنبد کے کبوتر، شوکت حیات ۲۰۱۰ء)

شوکت حیات کا ایک افسانہ ''گھونسلا'' ہے۔ اس کا وصف یہ ہے کہ یہ بالواسطہ پیرائے میں لکھی گئی تخلیق ہے جو مصنف اور قاری کے درمیان سفر کرتی ہے اور دونوں کو منزل بہ منزل تحیر و المیہ کے احساسات سے دوچار کرتی ہے۔ یہ تمثیلی کہانی اپنے عواقب میں پرانی روایت اور تہذیب کی امانت کے حوالے رکھتی ہے اور ایک پوری تہذیب کا المیہ بیان کرتی ہے۔ نئے نظام اقدار میں تہذیبوں کا تصادم فطری انداز میں اس افسانہ میں اُجاگر ہوا ہے۔ رکشہ والے کے رونے کا سبب اس افسانہ میں دیکھیں:

''تم جس علاقے، جس بستی کو ڈھونڈ رہے ہو، اسے عرصہ پہلے بلڈوزروں نے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا۔ میں بھی ہفتوں اسی طرح پورے شہر میں دیوانہ پاگلوں کی طرح چکر کاٹتا ہوا بار بار اسی چٹیل میدان تک پہنچتا تھا ...... بلڈوزروں نے سب کچھ اجاڑ دیا...... بھری پری بستی کو ملبے میں تبدیل کیا اور چٹیل میدان بنا دیا...... میری دکان، میرا گھر اور تمام اہل و عیال زندہ درگور ہو گئے...... بیٹے میں نے تو صبر کر لیا تھا، لیکن آج بار بار اس چٹیل میدان کو دیکھ کر پرانے زخم ہرے ہو گئے۔''

(گھونسلا، گنبد کے کبوتر)

ایک حقیقت کی تمثیل کا دوسری حقیقت کی تمثیل بن کر سامنے آنا اس افسانہ کا منفرد فنی وصف ہے جس کے سبب پڑھنے والوں کے دلوں کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔

افسانہ ''میت'' کو دیکھئے تو اس کے ذریعہ جہاں تلخ حقیقت سامنے آتی ہے، وہیں افسانوی لوازمات کی پیشکش کا منفرد انداز منفیات سے استفادہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جو شوکت حیات کے افسانوں کا منفرد وصف ہے اور کئی جگہ یہ چیز دیکھنے کو ملتی ہے۔ افسانہ ''بانگ'' کا ذکر بار بار ہوا کرتا ہے کہ اس میں خاص تکنیک نے کیا رنگ دکھایا ہے۔ علامت کے ذریعہ متعدد شیڈس بنانے کا فن شوکت حیات کو خوب آتا ہے اور یہ افسانہ اس کی خوبصورت مثال ہے، اسی طرح ایک افسانہ ''کہ'' ہے۔ اس افسانہ میں خاص طور پر جو چیز متاثر کرتی ہے وہ کفایت لفظی ہے۔ کفایت لفظی شوکت حیات کے افسانوں کا وصف بھی ہے۔ ''گنبد کے کبوتر'' کے کئی افسانے اس کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کفایت لفظی کے علاوہ ایک دوسرا افسانوی وصف جو اس افسانہ میں بھی

ہے، وہ ہے خوف کی نفسیات کا فطری استعمال۔ افسانہ کا یہ حصہ دیکھیں جو اندیشے کی فضا سے عبارت ہے:

''اس نے مڑ کر پھر دیکھا ـــــ دونوں لڑکوں میں سے ایک نے بھاری بھرکم کتابوں کے تھیلے میں ہاتھ ڈالا...... دوسرے لڑکے کی آنکھیں اس کی انگلیوں کا تعاقب کرتی ہوئی تھیلے میں داخل ہوئیں ـــــ یہ لڑکے ـــــ آخر وہی ہوا نا......! ـــــ یہ تھیلے میں سے بم نکالیں گے اور مجھے ڈھیر کر دیں گے ـــــ لیکن میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے......؟ ـــــ میں نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے......!'' (گنبد کے کبوتر، ص۲۹۲)

افسانہ ''گھڑیال'' ایک علامتی افسانہ ہے۔ جیسا کہ شوکت حیات کے چند ابتدائی افسانوں کو چھوڑ کر ان کے افسانوں کا وصف ہے، ترقی پسندی اور جدیدیت کے منفی حوالوں سے دامن بچا کر علامت و استعارہ کو ایک نئے تخلیقی وژن سے ہم کنار کرنا، سو یہ افسانہ اس کی مثال ہے جس میں تمثیلی پیرائے کو بھی وسعت دی گئی ہے اور اسے مابعد جدید افسانہ کہا گیا ہے۔ انسانی ہمدردی کے بین بین زمانہ کی تلخ اداؤں پر غیر اعلانیہ طنز کی چاشنی اس افسانہ کا بڑا وصف ہے۔ اردو افسانوں کا یہ وصف غیر معمولی تخلیقی جودت اور گہری فکر و نظر سے پیدا ہوتا ہے جو اس افسانہ میں موجود ہے۔ افسانہ کا یہ اقتباس بطور مثال ملاحظہ کریں:

''اے جی......تم خود کھو کھلے قہقہے لگا رہے ہو اور بیٹے کو بھی یہی سکھا رہے ہو!' سمیع صاحب نے قہقہہ لگانا بند کر دیا۔ کچھ دیر گم صم رہے۔ بیوی کی طرف غور سے دیکھا۔ آنکھوں سے گہری اداسی جھانک رہی تھی۔ 'سعیدہ تم سمجھتی کیوں نہیں، خالص قہقہوں کے دن لد گئے ......آنے والے زمانے میں کھوکھلا قہقہہ لگائے بغیر جینا مشکل ہو جائے گا، ابھی سے منے کو پریکٹس کرا رہا ہوں تا کہ وہ اس عہد کا ساتھ دے سکے۔'' (گنبد کے کبوتر، ص۲۶۳ و ص۲۶۴)

افسانہ ''کوبڑ'' جہاں فکری سطح پر اخلاقی زوال کی صورت دکھاتا ہے، وہیں افسانہ نگار نے اپنے Treatment سے اسے انفرادیت بھی عطا کر دی ہے۔ اس افسانہ کو متوسط طبقے کا علامتی بے نام نوحہ بھی کہا گیا ہے۔ محرومی اور ناامیدی کے احساسات کو اس طرح پیش کرنا کہ قاری کے دل و دماغ پر اس کا سراپا چھا جائے، اس افسانہ کی خصوصیت ہے۔ لاچاری، بے بسی، محرومی کے حوالے اس اقتباس میں دیکھیں:

''کوئی جواب دیئے بغیر امنڈتی ہوئی بھیڑ کے درمیان اس نے خود کو گٹھر میں تبدیل کر لیا۔ یہ ہنر اسے معلوم تھا کہ بچپن سے اب تک اکثر اوقات رنگین حالات کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسے خود کو بے جان اشیاء میں تبدیل کر دینا پڑتا تھا، ورنہ اس کے جیسے آدمی کے لئے جینا آسان نہ تھا۔ اس کے کمزور جسم میں مزاحمت کرنے، حالات پر قابو پانے اور رخ موڑ دینے کی طاقت نہیں رہی تھی۔'' (گنبد کے کبوتر، ص۴۰)

افسانہ ''بھائی'' کلائمکس کے خاص وصف سے مزین ہے۔ شوکت حیات کے اکثر افسانے آغاز و اختتام کے حسن و کشش سے عبارت ہوتے ہیں۔ اس افسانہ کے ذریعہ فساد میں گھرے شخص کے ذہن کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس افسانے میں ناپسندیدہ عناصر بھی ہیں اور پسندیدہ عناصر بھی اور ان دونوں کی شخصی فکر کی پیشکش افسانہ کا وصف خاص کہی جا سکتی ہے۔ افسانہ ''کوا'' کا وصف ڈاکٹر عظیم راہی اپنے تجزیہ کے ذریعہ یوں پیش کرتے ہیں:

''تاثر کی شدید کیفیت اور اس افسانہ کی واضح ترسیل افسانہ نگار کی کامیابی کی دلیل ہے جو قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور وہ سوچتا رہ جاتا ہے۔'' (تکمیل، ص۲۳۱)

''کوا'' کی علامت کے پس منظر میں دو الگ الگ تعبیر اس افسانہ کو منفرد بنانے کا ایک اور زاویہ سامنے لا دیتی ہے۔ دو اقتباس اس افسانہ سے ملاحظہ کریں جس سے روٹی غائب کرنے والے کوے اور مہمان کی آمد کی خبر دینے والے کوے سامنے آتے ہیں اور شہر و آبائی علاقہ کے درمیان سوچ کی تفریق یا اس کا سانحہ سامنے لاتے ہیں:

''......اس نے لڑکھڑاتے ہوئے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ منے نے پوچھا: 'بابا! ہم کہاں جا رہے ہیں ـــــ؟' 'ہم تمہارے بڑے ابو کے پاس جا رہے ہیں۔ جہاں کوئے تمہاری روٹی غائب کر سکیں......دیکھو بیٹے، وہی ہے ہمارا

پرانا گھر——تمہارے ابو وہیں رہتے ہیں!' 'بابا! بڑے ابو کے مکان کے چھپر پر بھی کوا بیٹھا ہے۔ منے نے چیختے ہوئے کہا: 'ارے بیٹا یہ روٹی غائب کرنے والا کوا نہیں ہے، یہ تو ہم لوگوں کی آمد کا نقیب ہے، تمہارے بڑے ابو کو اطلاع دے رہا ہے کہ مہمان آرہے ہیں۔' اس نے ہنستے ہوئے منے کو بتایا۔'' (گنبد کے کبوتر، ص ۲۷۴ و ص ۲۷۵)

افسانہ ''سرخ اپارٹمنٹ'' کئی افسانوی اوصاف کا حامل ہے۔ زبان و بیان، ماحول، مناظر اور مکالمے کی بنیاد پر معین الدین عثمانی نے اسے ایک شاہکار قرار دیا ہے:

''جہاں تک افسانے کی زبان و بیان، ماحول کی عکاسی، منظر کشی اور مکالموں کا تعلق ہے وہ نہایت چست اور فنکارانہ چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک عرصے سے اس دشت کی سیاحی میں مصروف ہیں اس لئے ان سے اسی طرح کے شاہکار کی امید کی جاسکتی ہے۔'' (تشکیل، ص ۲۴۱)

اس افسانہ کے ذریعہ شوکت حیات نے وقت کے ایک غیر معمولی واقعہ کو افسانوی تناظر دینے میں فنکارانہ مہارت دکھائی ہے۔ علامتوں کا خوبصورت اور برمحل استعمال اس افسانہ کے اوصاف کو انفرادیت بخشتا ہے۔ ذرا سقوط ماسکو کے واقعہ پر نظر ڈالئے اور یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''کچھ ہی دنوں پہلے اونچی سرخ عمارت منہدم ہوئی تھی۔ مکینوں کی نا عاقبت اندیشی نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا۔ کچھ لوگ تھے جنہیں گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ کھلی ہواؤں کے لئے جگہ جگہ روشن دان اور کھڑکیاں بنائی جارہی تھیں۔''

ایک خاص نظام کی ناکامی کا اس طور پر علامتی اعتراف شاید ہی کسی افسانہ کے ذریعہ سامنے آیا ہو۔ اسے شوکت حیات کے افسانے کا منفرد وصف نہیں تو کیا کہا جائے گا۔

رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے اور احسان فراموشی کے المیے پر کامیاب بیانیہ افسانہ کا جہاں ذکر ہوگا، وہاں شوکت حیات کا افسانہ ''اپنا گوشت'' نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قدروں کی پامالی کا فنکارانہ اظہار بھی شوکت حیات کے متعدد افسانوں کی خصوصیت ہے جو علامات و اساطیر اور تلمیحات کے باوجود ترسیل کے المیے سے محفوظ رکھتی ہے۔

درج بالا سطور میں جن افسانوں کے حوالے ہیں وہ سب مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' میں شامل ہیں۔ ان حوالوں سے اس حقیقت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے کہ شوکت حیات کے یہاں عنوان اور ابتدا اور اختتام نیز اس کی فضا کے درمیان ایک ایسی مماثلت، ایک ایسا رشتہ اور رابطے کا ایسا نظام قائم ہے جسے فکری وفنی تشکیلی نظام کا منفرد تیور کہا جاسکتا ہے۔ یہ اوصاف اپنی انفرادیت آپ ہیں اور شوکت حیات کو اس طور پر بھی منفرد اوصاف کے افسانوں کا خالق قرار دیتے ہیں۔ شوکت حیات کا یہ طرز فن اس کا اسلوب بھی ہے، اس کی نظر بھی ہے اور اس کا نظریۂ تطابق بھی۔ شوکت حیات کے افسانوں کے منفرد اوصاف میں وہ فکری زاویہ اور فنی طرز بھی شامل ہے، جس کی طرف خود شوکت حیات نے ایک انٹرویو میں اظہار خیال کیا ہے۔ آخر میں شوکت حیات کے افسانوں کے منفرد اوصاف کے حوالے سے خود شوکت حیات کے خیالات پیش کر رہا ہوں، ملاحظہ کریں، وہ کہتے ہیں:

''بڑے بھائیوں نے جس طرح 'بیانیہ' اور 'کہانیویت' کو مسخ کر دیا تھا اسے ہم نے بحال کیا ہے اور اب صنفی اعتبار سے افسانے کا افسانہ ہونا اس کا ناگزیر وصف ٹھہرا جس کی وجہ سے افسانے کا روٹھا ہوا قاری اس کی طرف واپس آرہا ہے۔ بڑے بھائیوں نے تجربہ پسندی کے نام پر انارکی پھیلا رکھی تھی اور پورے صنفی ڈھانچے کو تباہ برباد کر دیا تھا۔ ہم ۱۹۷۰ء کے بعد کی نسل کے لوگ اینٹ سے اینٹ جوڑ کر افسانے کی عمارت سازی کے کام میں منہمک ہیں۔ اکادکا لوگ ابھی بھی جناتی زبان اور چیستانی طریقہ کار اختیار کر رہے ہیں، لیکن ان سے افسانے کے مین اسٹریم کے بہاؤ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

(شوکت حیات سے اَن کہی باتیں، ڈاکٹر غضنفر اقبال، تشکیل، ص ۹۵)

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شوکت حیات کے افسانے متنوع اوصاف رکھتے ہیں اور ان کی انفرادیت کے جلوے ان کے افسانوں میں جگہ جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ ❁❁

ڈاکٹر آسیہ پروین
Assistant Prof., Deptt. of Urdu, Nalanda Mahila College, Biharsharif - 803101

جوشؔ: شاعری اور تنقید غزل

بیسویں صدی کے حوالے سے اردو ادب وصحافت اور خصوصاً اردو شاعری کی تاریخ میں شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ ۵؍دسمبر ۱۸۹۸ء کو اس جہانِ فانی میں آئے اور تقریباً ۸۴ سال عمر پاکر ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو اس دنیا سے چل بسے۔ نثریات سے قطع نظر شاعری میں جوشؔ کی ادبی باقیات کو بالعموم غزل اور نظم یعنی دو حصوں میں رکھا گیا ہے اور اس میں بھی دورائے نہیں کہ بہرحال ان کی بیشتر توجہ نظم ہی کی طرف رہی۔ بقول علی جواد زیدی:

> ''یہ میدان آپ کی جولانی طبع کے لئے اتنا وسیع تھا کہ اس نے آپ کی تمام خصوصیات کو نمایاں کرکے آپ کی شاعری کو حیات مستقل عطا کر دی۔ حضرت جوشؔ کی شاعری دل کی شاعری ہے۔ وہ دل سے کہتے ہیں اور دل پر اثر ہوتا ہے۔ جوشؔ کے کلام میں یاس وحرماں نصیبی بہت کم ہے۔ وہ بزدلی کو پاس نہیں آنے دیتے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر مصیبت کے بعد خوشی آتی ہے، صرف ہوشیار ہوجانے کی ضرورت ہے۔ دورحاضر کی اشترا کی شاعری کی بنیاد جوشؔ کی وجہ سے پڑی جس میں مزدور پیشہ کی حمایت اور سرمایہ داری کی مخالفت خاص موضوع ہیں۔ بیبا کی اور زوران کے کلام کی جان ہے۔ وہ معاشرتی و سیاسی نظام پر رائے زنی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کلام زیادہ تر تنقید حیات پر مبنی ہے۔ جوشؔ کی غزلیں بھی سرمستی اور کیفیت کا بیان ہیں۔'' (اردو شعرا کا مصور تذکرہ، ص ۳۱)

جوشؔ کی شاعری کے باب میں دیگر ناقدین اور مورخین ادب کے یہاں بھی اسی قسم کے بیانات ملتے ہیں۔ جوشؔ کو بنیادی طور پر نظم کا شاعر قرار دیا جاتا ہے جو ہرگز غلط نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جوشؔ کی غزل گوئی بھی تذکرے میں آتی رہتی ہے، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جوشؔ کی نظم نگاری پر اظہار خیال کے بعد ڈاکٹر اعجاز حسین اپنی کتاب ''مختصر تاریخ ادب اردو'' میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ:

> ''جوشؔ کی غزلیں سرمستی وکیف کا بیان ہیں۔ محبت کے واقعات کی تفصیل، حسن کی کرشمہ سازیوں کی داستانیں ان کے یہاں نہایت خوبی سے اشعار میں جگہ پاتی ہیں۔ چونکہ وہ خود راہِ محبت میں گم ہو چکے ہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں دل کی چوٹ ہوتی ہے، دماغ کی کاوش نہیں۔'' (مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۱۴۶)

کھلی ہوئی بات ہے کہ جوشؔ کی نظموں اور غزلوں کے بارے میں مذکورہ خیالات سے بنیادی اختلاف کی نہ تو گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت، مزید یہ بھی کہ اس وقت محض جوشؔ کی شاعری پر لکھنا ہمارا مقصود بھی نہیں بلکہ درج بالا رسمی تمہید کے ساتھ ہم اُس موضوع کی طرف ارادتاً آنا چاہتے ہیں جس کا تعلق جوشؔ کے نظریہ غزل، یا غزل کی شاعری پر جوشؔ کی نکتہ چینی سے ہے۔

غزل کی مخالفت میں لکھنے والوں کا سلسلہ شروع سے ہی رہا ہے۔ شاید اُس وقت سے ہی جب فارسی کے شاعر حافظؔ سے یہ کہا گیا تھا کہ آپ کی شاعری کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی چڑیا پھدک کر کبھی اِس ڈال پر اور پھر کبھی اُس ڈال پر جا بیٹھتی ہو۔ فارسی سے قطع نظر جہاں تک اردو میں غزل تنقید کا معاملہ ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اس صنف پر خواجہ الطاف حسین حالؔی کے قلم سے اعتراضات کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ آگے ہی بڑھتا رہا، یہاں تک کہ بیسویں صدی کے نصف میں اس نے کچھ زیادہ ہی بال و پر نکالے۔ صنف غزل پر حالؔی نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ بہرحال اُس وقت کے لحاظ سے بہت ہی ضروری،

برجستہ اور مخلصانہ تھے اور بقول ڈاکٹر غلام رسول ساجد:

''حالی کی اصلاح کا نعرہ بالکل ٹھیک تھا کیوں کہ اس سے غزل پر مختلف انداز سے سوچنے کا موقع ملا'' (اردو کی منتخب تاریخوں کا تنقیدی جائزہ، مطبوعہ ۱۹۹۷ء، ص ۴۳۷)

خواجہ الطاف حسین حالی کے بعد غزل پر انگلی اٹھانے والوں میں نظم طباطبائی اور عظمت اللہ خاں کے نام مشہور زمانہ ہیں۔ نظم طباطبائی کے خیالات ان کے مجموعہ کلام ''صوت تغزل'' کے آغاز میں بہ عنوانِ ''غزل'' دیکھے جاسکتے ہیں اور صاف صاف محسوس کیا جاسکتا ہے کہ وہ غزل گوئی کو شاعر کے حق میں ایک قسم کی عجز بیانی کے مترادف سمجھتے ہیں۔

جہاں تک غزل کے بارے میں عظمت اللہ خاں کے خیالات کا تعلق ہے، انہوں نے صاف لفظوں میں غزل کو ''ریزہ خیالی اور پریشان گوئی کا ایک ڈراؤنا خواب'' بتایا ہے اور اپنی کتاب ''سریلے بول'' میں صفحہ ۳۱ پر اس کا اظہار کرتے ہوئے اسی کتاب میں صفحہ ۳۶ پر یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

''اب وقت آ گیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان ماردی جائے۔''

غزل کے حق میں عظمت اللہ خاں کے قلم سے گردن زدنی کا یہ فتویٰ مشہور زمانہ ہے۔ اسی طرح غزل کے بارے میں کلیم الدین احمد کے خیالات بھی خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' (ص ۶۹) میں ''غزل کو نیم وحشی صنف سخن'' کہا ہے، پھر صنف غزل پر انگشت نمائی کرنے والوں میں ظ انصاری اور اختر الایمان کے علاوہ جوش ملیح آبادی کا نام بھی آتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جوش کا نام کلیم الدین احمد، ظ انصاری اور اختر الایمان سے پہلے آتا ہے اور ہندوستان ہی نہیں پاکستان کے شاعر کی حیثیت سے بھی وہ شاید اکیلے فن کار ہیں جنہوں نے اس موضوع کو ارادتاً اپنی پسند سے نوازا ہے۔

کلیم الدین احمد، ظ انصاری اور اختر الایمان کے خیالات کی تفصیلوں سے قطع نظر جہاں تک جوش کے خیالات کا معاملہ ہے، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے شاید اپنے تخلص کی رعایت سے، نہایت ہی جوشیلے انداز میں اپنی باتیں صفحہ قرطاس پر لائی ہیں۔

غزل کی مخالفت پر جوش کے تین مضامین ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پہلے مضمون کا سال اشاعت ۱۹۳۶ء ہے جب کہ دہلی کے ماہنامہ ''کلیم'' میں انہوں نے اس مسئلہ کو چھیڑا تھا اور بقول خویش یہ سمجھتے ہوئے چھیڑا تھا کہ ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور موافقت میں، بشکل تمام دو چار سے زیادہ آوازیں بلند نہ ہوسکیں گی۔ جوش کے اس مضمون کی اشاعت کا سال بتا رہا ہے کہ اس کا رشتہ ترقی پسند تحریک سے کتنا قریب ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں جوش ملیح آبادی نے ایک جوابی مضمون کے طور پر اس موضوع کو اٹھایا، پھر تقریباً بیس بائیس سال کے بعد، جب کہ جوش پاکستان جا چکے تھے، اس سلسلے میں یعنی غزل کی مخالفت پر ان کی ایک ریڈیائی تقریر نشر ہوئی اور اس کا متن ۱۹۵۸ء کے رسالہ ''ماہ نو'' کراچی میں شائع ہوا اور باقاعدہ ایک طویل ادبی مباحثہ کا موضوع بنا۔ اب یوں کہا جاسکتا ہے کہ تقریباً دو دہائی کی مدت اور تین بار کی کوشش میں جوش ایک غزل مخالف کے روپ رنگ میں کھل کر سامنے آئے، یہ اور بات ہے کہ غزل کی مخالفت میں اُن کا نظریہ بھی اُسی ادبی وفکری حشر سے دوچار ہوا جو ان کے دیگر ہم نواؤں کا مقدر بنا۔

جوش ملیح آبادی کے اس غزل مخالف رویے پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عادل حیات نے اپنی حالیہ کتاب ''غزل کی تنقید'' میں صفحہ ۴۲۹ پر لکھا ہے کہ:

''غزل کا ایسا شعر کہنا جو کوزے میں دریا کو بند کرنے کا کرشمہ دکھاتا ہے، غالباً ان (جوش) کے بس کا نہ تھا، اس لئے انہوں نے غزل کی مخالفت پر کمر کس لی۔ ان کا یہ عمل بالکل ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ ہم نظم والے ہیں اس لئے غزل کے مخالف ہیں۔''

یہ بات صرف اکیسویں صدی کے ایک تجزیہ نگار کے قلم سے کاغذ پر نہیں آئی ہے بلکہ اس مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے مقبول نقش نے بھی تقریباً ساٹھ سال پہلے یہی لکھا تھا کہ:

''جوش صاحب اپنے مزاج اور افتادِ طبع سے کسی حد تک مجبور ہیں۔ توڑ پھوڑ، گھن گرج اور لہجے کی کرختگی، اگر

ان کی شخصیت میں کوئی چیز ہے تو یہی اور صرف یہی افتاد
طبع اور مخصوص مزاج۔ زیر بحث مضمون میں بھی ان کی
شخصیت اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔''

(تنگنائے غزل، ماہ نو کراچی، ص ۲۰)

ہمیں اس سے اگر چہ انکار نہیں کہ محض ذات کے حوالے سے بات کا اعتراض نہیں اٹھتا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جوشؔ کے غزل مخالف رویہ کو کسی نہ کسی طرح ان کی ذاتی یا شعری نفسیات سے یکسر الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے اور پھر یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی کے ذریعہ یہ قضیہ چھیڑے جانے کے چند سال بعد ۱۹۴۰ء میں ہی کلیم الدین احمد کی کتاب میں نہایت شد و مد سے غزل کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور اُسے ''نیم وحشی صنف'' کا لقب دیا گیا، گویا ایک قسم کی خاموش تحریک شاید کہ کلیم صاحب کو جوشؔ سے بھی ملی۔ یہاں لفظ بھی اس لئے لکھا جا رہا ہے کہ بہر حال جوشؔ سے پہلے بھی غزل مخالف طرح پڑ چکی تھی۔

غزل پر حالیؔ کے اعتراضات ہمیں یاد ہیں، انہوں نے موضوعات حسن و عشق کے حوالے سے جو کچھ کہا تھا، اس کا مدعا بہر حال ابتذال و رکاکت سے بچنے کی ترغیب دینا تھا، مگر جوشؔ کے اعتراضات کی انتہا پسندی کا رُخ یہ ہے کہ انہوں نے حسن و عشق کے موضوعات کو غزل سے یکسر خارج کر دینے پر ہی زور دیا ہے۔ جوشؔ کی نظر میں اگر ''غزل غیر فطری کلام ہے'' تو پھر سوچا جا سکتا ہے کہ حسن و عشق کو جو زندگی اور زمانے کی ایک ابدی سچائی ہے، اقلیم غزل سے باہر کر دینا کہاں تک فطری مطالبہ یا فطرت پسندی کہلا سکتا ہے۔

غزل کے تعلق سے جوشؔ کے خیالات پر جب ادبی مباحثہ چل رہا تھا تو اس میں جمیل الدین عالی، ڈاکٹر تاثیر، حجاب امتیاز علی، مقبول نقش، تابشؔ دہلوی اور آثرؔ جلیلی وغیرہ نے حصہ لیا تھا اور بہر صورت ان کے ذریعہ جوشؔ کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا گیا تھا اور صرف ذات کے حوالے سے نہیں بلکہ بات کے حوالے سے صریح طور پر جوشؔ کے اعتراضات کالعدم بنا دئے گئے تھے۔

اُس زمانے میں جوشؔ ملیح آبادی اور ان کے ہم نواؤں نے

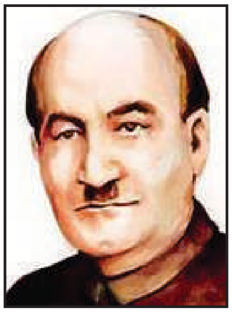

عروس غزل کو معرضِ خطاب میں لاتے ہوئے بہت ساری باتیں کہی تھیں، مثلاً یہ کہ غزل میں معشوق کا مذکر ہونا اور نئے خیالات کے لئے مطلق گنجائش نہ ہونا اس کا بڑا عیب ہے۔ غزل کا محبوب ماورائی ہے، اس میں بوالہوسی و پست خیالی ہے، غزل کا ہر شعر جداگانہ اور متضاد مضمون رکھتا ہے۔ غزل کے شعرا معانی و مطالب کے لئے الفاظ نہیں ڈھونڈتے بلکہ الفاظ کے لئے معانی و مطالب کی جستجو کا غیر فطری طریقہ اپناتے ہیں۔ اردو اور فارسی کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں میں اس صنف کا وجود نہ ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ غزل محض ایک بیکار سی چیز ہے۔ غزل کی شاعری میں ایک عاشق کے اَن گنت رقیب ہوتے ہیں اور جبراً طاری کردہ مصنوعی جذبات ظاہر کئے جاتے ہیں، اس لئے غزل کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے۔

جوشؔ ملیح آبادی کے لفظوں میں ''غزل مصنوعی اور جھوٹی شاعری کا آلہ کار'' ہے اور ''غزل گو شعرا صحیح معنوں میں شاعر ہی نہیں ہیں'' ان کا کام ''فقط قوافی کی یکجائی'' ہے اور ان کلام ''فقط چند روایات اور چند الفاظ کا ایک مجموعہ'' جو بہر صورت تجربات و مشاہدات کے ذریعہ جذبات میں ہیجان لانے سے قاصر ہوتا ہے۔

جوشؔ نے غزل گوئی کے طریقے پر اعتراض کرتے ہوئے اسے الفاظ کے ذریعہ سے جذبے کے اظہار کا غیر فطری اور غلط طریقہ اپنانے کے مصداق قرار دیا ہے اور اسی لئے اسے الہامی یا حقیقی شاعری ماننے کے لئے وہ قطعاً تیار نہیں ہیں۔ جوشؔ کے لفظوں میں ''ساری سخنوری ردیف وقافیہ کی ہے اور اپنی تعدیلوں اور تحریفوں میں انہیں کے رحم و کرم پر'' ہے، اس لئے وہ ناقابل التفات ہے۔ ''غزل شدید انتشار طبع میں مبتلا کر دیتی ہے'' اور غزل کی محفل میں متضاد طبع کے لوگوں کا اجتماع رہتا ہے۔ غزل کے شعرا ایک طرف اختصار و ایجاز کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کے یہاں بے پناہ تکرار اور اعادہ بھی ملتا ہے۔

جوشؔ کے خیالات کی رُو سے غزل غیر فطری صنف کلام اور اَسّی فیصد عاشقانہ مضامین کا پلندہ ہے جس میں رقیبوں کے ساتھ دن

رات جوتی پیزار کے ''معاملہ رنگیں'' سے زیادہ کچھ نہیں۔ جوشؔ کی نظر میں غزل محض ''اوچھی پونجی'' ہے اور خوردہ اندیشی اور خوردہ فروشی کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جوشؔ نے غزل کی مخالفت میں لکھتے ہوئے بزعم خویش صرف اس کی خرابیاں اور برائیاں ہی بیان نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

> ''غزل کو باقی رکھنے میں ادبی نقصان اور سیاسی خطرہ ہے لہٰذا غزل اور مشاعروں کی متعارف غزل سرائی کے تابوت کو اتنا گہرا دفن کر دینا چاہئے کہ اس کے حشر جسد پر مہر ثبت ہو جائے۔'' (ماہنامہ ''کلیم''، دہلی جنوری ۱۹۳۶ء، ص ۶۱ و مئی ۱۹۳۷ء، ص ۴۵۰)

گویا غزل پر اعتراضات کی بوچھار کرتے ہوئے جوشؔ نے نہ صرف اُن ہی باتوں کا اپنے انداز سے سہارا لیا ہے جو کیفیؔ اور طباطبائی بھی کہہ گئے تھے بلکہ مزید شدت کے ساتھ کچھ ایسا ہی فتویٰ بھی صادر کیا ہے جو ان کے دونوں پیش رو معاندین نے غزل نے صادر کیا تھا، یہاں تک عاشقانہ غزل اور محفل مشاعرہ پر بھی شاعر انقلاب و شباب کی تنقید غزل انتہائی جذبات تک پہنچ گئی ہے۔

یہ تو صحیح ہے کہ مجموعی لحاظ سے غزل کی مخالفت نے نہ تو جوشؔ کے شاعرانہ مرتبہ میں تخفیف آنے دیا اور نہ ہی اس سے غزل کی مقبولیت اور اس کی اصولی وقعت پر حرف آیا، اس لئے کہ ان کے یہاں بعض اعتراضات محض بہر گفتنی ہیں یا پھر تھوڑی سی جزوی صداقت کے مصداق جس کا تجزیہ ارباب نقد و نظر نے نہ صرف ان کی زندگی میں کر دیا بلکہ اکیسویں صدی میں بھی ''غزل کی تنقید'' پر لکھنے والے ڈاکٹر عادل حیات اور دیگر اہالیانِ نقد و تحقیق حضرات نے اپنے موقف مبرہن کر دیے ہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ اگر جوشؔ کی شاعرانہ عظمت کا ہم اعتراف کرتے ہیں تو ہماری ذمہ داری کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ غزل کے باب میں جوشؔ کے ناقدانہ خیالات کا کوئی حصہ ہمیں تطہیر فکر و فن اور حزم پسندی کی طرف آنے کا اشارہ دے رہا ہو تو ہم اسے محض غزل پسندی اور مشاعرہ پسندی کے نام پر یکسر نظر انداز نہ کریں۔ ❁❁

کچھ باتیں تنقید کی

تنقید کیا ہے؟ اس سوال کے تعلق سے فرانسس بیکن نے یہ رائے دی ہے کہ تردید کرنے یا غلط ثابت کرنے کے لئے نہ پڑھو اور نہ ہر چیز کو سچ سمجھ لو اور اس پر اعتبار کرو، محض گفتگو کرنے کے لئے بھی نہ پڑھو بلکہ وزن کرنے اور غور و فکر کرنے کے لئے پڑھو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تنقید اور مقصد مطالعہ میں ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ ادبی تنقید اسی وقت مفید مطلب ہو سکتی ہے جب کہ نظر اور نظریہ صالح، مخلصانہ، سنجیدہ اور با مقصد ہو۔ ادبی تنقید کے بارے میں ارسطو کا یہ قول بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ تنقید اچھا فیصلہ کرنے کا معیار ہے۔ اس قول سے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ اگر ایک ناقد اچھے فیصلے تک نہیں پہنچتا ہے تو وہ حقیقی ناقد ہی نہیں ہے۔ آرنلڈ نے تنقید کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ دنیا میں جو چیزیں بہترین جانی اور سمجھی جاتی ہیں، تنقید انہیں سیکھنے اور ان کی ترویج کا آلہ ہے۔ گویا تنقید اور خصوصاً ادبی و علمی تنقید اگر بہترین آفاقی قدروں کی آموزش اور ان کی ترویج و اشاعت کے کام نہ آسکے تو وہ تنقید نہیں کچھ اور ہے یا یوں کہیں کہ بے مقصد اور ناکام عمل ہے۔ ہنری جیمز نے بتایا ہے کہ ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ فن کار کا اپنا موضوع ہوتا ہے، اپنا خیال ہوتا ہے اور اپنا عطیہ، ہمیں اس سے بحث نہیں بلکہ ہمیں صرف یہ دیکھنے سے واسطہ رکھنا ہے کہ وہ ان چیزوں سے کیا کام لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نقاد کا فرض ایک خاص دائرے تک ہے اور وہ دائرہ اصل میں موضوع و خیال اور مواد کے تعلق سے مقصدیت کی پرکھ ہے۔ اب رہی بات یہ کہ اچھا نقاد بننے کے لئے کون کون سی باتیں لازمی شرط کہلا سکتی ہیں؟ اس تعلق سے آئی۔ اے۔ رچرڈز نے بتایا ہے کہ ایک نقاد جس فن پارے کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہتا ہے، اس کے تعلق سے اُس کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ دماغی حالت میں کسی خلل کے بغیر وہ تجربہ کر سکے۔ اس کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ مختلف تجربات میں ان کی سطحی خصوصیات سے قطع نظر امتیاز کر سکے اور پھر وہ قدروں کا معقول پارکھی بھی ہو۔ یہ تین باتیں گویا تنقید کا ساز و سامان ہیں۔ ان کے بغیر تنقید کے عمل کو اعتبار نہیں مل سکتا۔ (ماخوذ)

فرزانہ اسد

30, Gulistan Colony, Near Pande Amrai Lawns, Nagpur - 440013
(M.S.) (Mob. 9579591149)

حجاب امتیاز علی اور ان کی افسانہ نگاری

زبان وادب کی خدمت کا سہرا اگرچہ ہر زمانے میں عموماً مردوں کے سر رہا ہے، لیکن خواتین نے بھی اس ضمن میں بہر حال مختلف سطحوں پر ہمیشہ گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ گھریلو ذمہ داریوں اور سماجی پابندیوں کے سبب اس شعبے میں بہت زیادہ تعداد میں خواتین نظر نہیں آتیں، تاہم اردو زبان کی مختلف اصناف میں کئی نسوانی نام ملتے ہیں جنھوں نے ادب میں اپنی شناخت قائم کی اور عام روش سے ہٹ کر زبان وادب کو نئے رنگ وآہنگ اور مزاج واسلوب سے آراستہ کیا۔ ان خواتین میں ایک اہم نام حجاب امتیاز علی تاج کا بھی ہے۔

حجاب امتیاز علی کو اردو کی معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے علاوہ مشہور ادیب امتیاز علی تاج کی شریک حیات ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ انہیں ایک اعزاز، یہ بھی حاصل ہے کہ ان کا ذکر برٹش گورنمنٹ کی پہلی ہوا باز خاتون کے طور کیا جاتا ہے۔ حجاب کی پیدائش کے متعلق دو مختلف روایات موجود ہیں۔ بقول جان نثار معین:

''حجاب امتیاز علی ۴ نومبر ۱۹۰۸ کو حیدرآباد کے ایک مقتدر گھرانے میں پیدا ہوئیں ان کے والد سید محمد اسمٰعیل نظامِ دکن کے فرسٹ سکریٹری تھے۔'' (حجاب امتیاز علی کا ایک مختصر تعارف، ماہنامہ خواتین کی دنیا، اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۵)

اس کے برعکس مشہور ادیب علیم صبا نویدی لکھتے ہیں:

حجاب امتیاز علی کی ولادت بڑی پیٹ، وانم باڑی (ضلع شمالی ارکاٹ) میں ہوئی۔ جن دنوں مولانا سید بلگرامی حیدرآباد میں معتمد تعمیرات تھے، ان دنوں مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی بود و باش کچھ عرصے کے لیے وانم باڑی سے حیدرآباد تبدیل ہوگئی تھی...... بعض احباب کا خیال ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل کے حیدرآباد قیام کے دوران ہی حجاب کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی، مگر یہ بات مشہور ہے کہ حجاب وانم باڑی ہی میں غالباً ۱۹۰۷ میں پیدا ہوئیں اور راقم کا بھی یہی اندازہ ہے۔'' (حجاب امتیاز علی تاج، ماہنامہ سبق اردو، بھدوہی، جنوری ۲۰۰۵ء ص ۲۵)

حجاب امتیاز علی تاج کی والدہ اپنے زمانے کی ایک مشہور قلم کار تھیں۔ وہ تعلیم نسواں کی پرزور حامی تھیں، مگر ان کے ہاں دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم کا بھی رواج تھا۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو بہترین تعلیم سے آراستہ کیا، چنانچہ اپنی والدہ کی کئی خوبیاں حجاب میں بھی نظر آتی ہیں۔ مضمون نویسی کا شوق بھی ان میں اپنی والدہ ہی کی بدولت پیدا ہوا تھا۔ حجاب کی تعلیم مدراس کے کرشچن کالج ہائی اسکول میں ہوئی تھی جہاں اردو بحیثیت زبان پڑھائی جاتی تھی۔

حجاب نے تقریباً تیرہ سال کی عمر سے لکھنے کا آغاز کیا۔ جنگ آزادی سے پیشتر ان کی تخلیقات ''عالمگیر'' اور ''پھول'' دہلی میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''میری ناتمام محبت'' ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ حجاب کے جن افسانوں کو شہرت حاصل ہوئی ان میں ''لاش''، ''صنوبر کے سائے''، ''میری ناتمام محبت''، ''الیاس کی موت'' اور ''موت کا راگ'' قابل ذکر ہیں۔ ان تخلیقات میں ان کی اپنی شخصیت کے

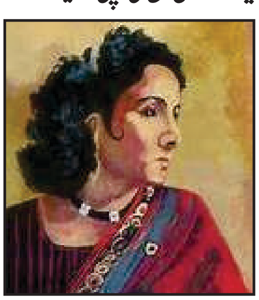

نقوش بھی ملتے ہیں اور ان کے ماحول کی بھرپور عکاسی بھی موجود ہے۔ حجاب امتیاز علی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''میری نا تمام محبت'' اور دوسرے رومانی افسانے ۱۹۳۲ء

میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعدان کے متعددافسانوی مجموعے منظرِعام پر آئے جن میں ''لاش'' اور دوسرے ہیبت ناک افسانے (۱۹۳۳ء) ''کاؤنٹ الیسا کی موت'' (۱۹۳۵) اور ''تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے''(۱۹۳۹ء) قابلِ ذکر ہیں۔

حجاب امتیاز علی کی دلکش تحریروں میں زبان و بیان اور فن افسانہ نگاری کی کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔افسانوں کے پلاٹ چست، مربوط اور کردار رومانیت اور جذبات میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حجاب امتیاز علی تاج کو عوامی زندگی سے کوئی خاص واسطہ نہیں تھا، تاہم ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا تھا۔ان کی تخلیقات میں ابھرنے والے کردار میں جذبات کی فراوانی نظر آتی ہے،اسی کے ساتھ اس دور کے سماجی مسائل بھی ان کی نگارشات میں موجود ہیں۔ان کے افسانے ''نغمہ موت'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں جانتی ہوں تم کو سمندر کے نیلگوں پانیوں اور سفید موجوں سے عشق شدید تھا! خوبصورت دھوپ اور نرم چاندنیوں سے تمہیں سرور حاصل ہوتا تھا۔شاعر کے گیت اور فاختاؤں، بلبلوں کے عشق کی صدائیں تمہیں بیخود بنا دیتی تھیں۔غروب وطلوع کے نظارے تمہیں دیوانہ بنا دیتے تھے۔آہ تم میرے لیے نوعمر بے تکلف ساعت کی کھیلی ہوئی سہیلی تھیں اور ہر موضوع پر آزادانہ، دلربایانہ انداز میں بحث و گفتگو کیا کرتی تھیں۔''

پراسرار اور دہشت ناک کہانیاں لکھنے والے افسانہ نگاروں میں حجاب امتیاز علی تاج کا بھی نام آتا ہے۔انھوں نے اپنی آپ بیتی ''موم بتی کے سامنے'' میں بہت ساری باتیں لکھتے ہوئے دہشت ناک کہانی نویسی کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان کے بچپن کا ابتدائی زمانہ دریائے گوداوری کے کنارے واقع رہائش گاہ میں گزرا جہاں دریا کے کنارے جلائی جانے والی لاشوں کے بھیانک مناظر بھی ان کے مشاہدے میں آتے رہے۔اس میں دورائے نہیں کہ حجاب کے افسانوں میں تجسس اور طلسماتی اور رومانی فضا ملتی ہے اور ان کے کردار ہمیں ایک پراسرار دنیا کی سیر کراتے ہیں۔اس قسم کے افسانوں میں حجاب کی منظر نگاری بہت عمدہ ہے۔

حجاب امتیاز علی فطری طور پر کم آمیز ہونے کے باوجود اپنے عہد کے بڑے قلم کاروں سے رابطے میں تھیں۔خاص طور پر قرۃ العین حیدر، رضیہ ظہیر، نذر سجاد حیدر اور شوکت تھانوی وغیرہ سے ان کے اچھے مراسم تھے۔شوکت تھانوی اپنے مخصوص انداز میں ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میں ان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ حجاب امتیاز نہ تھیں بلکہ مس حجاب اسماعیل تھیں اور ان کے افسانے 'تہذیب نسواں' میں چھپا کرتے تھے......اس زمانے میں محترمہ حجاب امتیاز علی کا میں بس اتنا مطالعہ کر سکا کہ وہ گویا کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں کچھ بے نیاز سی اور الگ تھلگ......ان کی دنیا ہی دوسری دنیا ہے اور وہ دنیا خود انھوں نے اپنے لیے وضع کی ہے۔یہ وہی دنیا ہے جو ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔حجاب امتیاز علی تجزیۂ نفس کی دلدادہ ہیں اور فن کا گہرائی سے مطالعہ کر چکی ہیں۔'' (حجاب امتیاز علی تاج، علیم صبا نویدی، ماہنامہ سبق اردو، بھدوہی، جنوری ۲۰۰۵، ص ۲۶)

حجاب کی متعدد کتابیں مثلاً ''احتیاطِ عشق''، ''کالی حویلی''، اور ''ظالم محبت'' وغیرہ گواہ ہیں کہ انہوں نے اپنے مخصوص اسلوب، افسانوی بیانیہ اور افسانوں کی تخیلاتی فضا کے علاوہ اپنے موضوعات اور کرداروں کے سبب اپنی ایسی پہچان بنائی تھی جو آج بھی روشن ہے۔ ❁❁

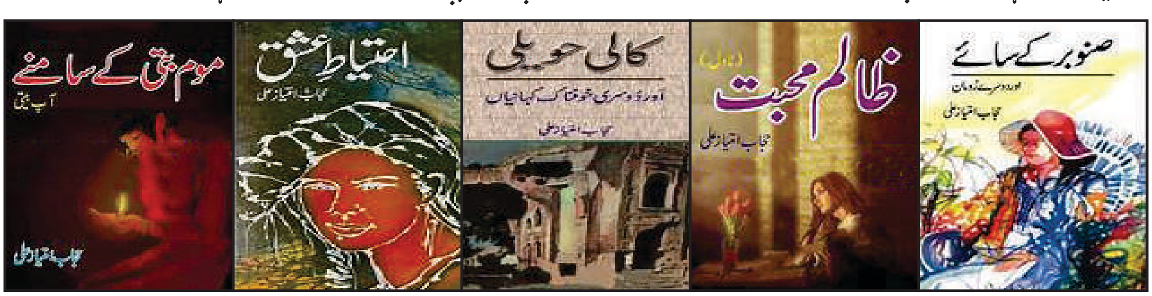

افسانے

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
Lane No.3, House No.7, Firdousabad, Sunjwan, Jammu - 180011
(Jammu & Kashmir) (Mob. 7889952532)

ساڑھے آٹھ جملے

احترام الحیات نے اپنا ناول لکھنے سے پہلے چند اہم باتیں ذہن نشیں کرلی تھیں ۔پہلی بات یہ کہ وہ ایک ایسا ناول لکھے گا جس کا عنوان تجسّس آمیز ہو۔دوسری بات یہ کہ اُس کا موضوع نہایت اہم اور اچھوتا ہو۔تیسری بات یہ کہ اُس میں کمال کی فنکاری اور زبان وبیان کی سحر انگیزی ہو۔چوتھی بات یہ کہ وہ حقیقت وادبیت کا حسین امتزاج ہو۔

ان تمام باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اُس نے اپنے ناول کے لئے ایک عنوان ''یہ کہاں آ گئے ہم'' تجویز کیا اور پورے جوش و جذبے کے ساتھ اُس نے حیات وکائنات کی صداقتوں کوموضوع بناتے ہوئے ناول لکھنا شروع کیا۔اُس نے مختلف واقعات کی منطقی ترتیب کے تحت پلاٹ سازی، کردار نگاری، ماحول ومنظر نگاری، مکالمہ نگاری اور زبان وبیان پرخاصی محنت کرنے کے بعد تقریباً تین سال میں چارسواسّی صفحات پہ مشتمل ناول ''یہ کہاں آ گئے ہم'' لکھا۔

اس ناول کو لکھنے کے دوران احترام الحیات نے کافی محنت کی ۔اُس کی تخلیقی حس نے اُسے اس بات پرخاص دھیان دینے پر مجبور کیا کہ کوئی بھی واقعہ غیرضروری قرار نہ پائے اور نہ ہی کوئی ایسا جملہ لکھا جائے جو غیر ادبی ہو اور رسوائی کا باعث بنے، کیونکہ اُسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ شاعری اور فکشن نگاری کے منفی ومثبت اثرات قارئین کے دل ودماغ میں تادم حیات موجود رہتے ہیں،اس لئے اُس نے اپنے ناول ''یہ کہاں آ گئے ہم'' کا مسودہ تیار کرنے کے بعد اُس کے ایک ایک لفظ پہ بار بار غور وفکر کیا۔تخلیقی عمل کے دوران جہاں زبان و بیان کی غلطیاں رہ گئی تھیں اُنھیں دُرست کیا۔کرداروں کی آپسی بات چیت کوموثر بنانے کے لئے کچھ جملوں میں حذف واضافہ کیا۔بار بار فنی لوازمات کے برتاؤ پر دھیان دیا تاکہ کہانی پن میں کسی طرح کا جھول باقی نہ رہے۔

اپنے ناول کو بہت زیادہ معیاری بنانے کے لئے وہ جتنی محنت کرسکتا تھا وہ اُس نے کی۔جب اُسے اس بات کی تسلی ہوئی کہ اُس کا لکھا ناول تمام فنی، موضوعاتی اور زبان وبیان کی خوبیوں کے اعتبار سے مکمل ہے، تب اُس نے یہ چاہا کہ وہ کتابی صورت میں اسے شائع کرانے سے پہلے اس کا مسودہ ملک کے مشہور ومعروف شاعر، خاکہ نگار، محقق اور فکشن کے نقاد صغیر القمر کے نام و پتے پہ اس لئے بھیج دے تاکہ وہ اسے پڑھنے کے بعد ایک بے لاگ اور بصیرت افروز تنقیدی مضمون لکھ کے مسودہ واپس کردیں۔

احترام الحیات کو دل ہی دل میں یہ خوشی ہورہی تھی کہ صغیر القمر کا تنقیدی مضمون جب اُس کے ناول کے ابتدائی صفحات میں شامل اشاعت رہے گا تو اُس کے ناول کی عظمت میں اضافہ ہوگا۔اسی خوش فہمی میں اُس نے ایک دن صغیر القمر کو فون کیا۔اُس نے سلام ودُعا کے بعد کہا:

''جناب میں احترام الحیات عرض کررہا ہوں......آپ خیریت سے ہیں؟''

صغیر القمر نے فوراً احترام الحیات کی آواز پہچان لی، کہنے لگے:

''ارے! احترام، کیا حال ہے؟''

''جناب اللہ کے فضل سے خیریت سے ہوں۔''

صغیر القمر بولے:''بھائی آپ کی تحریریں اخبارات ورسائل میں پڑھتا رہتا ہوں۔بہت اچھا لکھتے ہیں آپ، خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ!''

''جناب یہ سب اللہ تعالیٰ کا مجھ پہ کرم ہے کہ لکھنے پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے حال ہی میں اپنا پہلا ناول 'یہ کہاں آ گئے ہم' مکمل طور پر لکھ لیا ہے۔میرا یہ ناول مسودے کی صورت میں چارسواسّی صفحات پہ مشتمل ہے۔اسے آپ کی

خدمت میں آپ کے نام و پتے پہ برائے مطالعہ وبصیرت افروز تنقیدی مضمون کی فرمائش کے ساتھ ارسال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی اجازت ہوتو ناول ارسال کردوں؟''

صغیرالقمر نے کسی حدتک مسرت آمیز لہجے میں کہا:

''ارے! کیابات ہے، آپ کو میری طرف سے بہت بہت مبارک۔ پہلی فرصت میں میرے نام و پتے پہ اپنا تحریر کردہ ناول بھیج دیجیے۔ میں اسے لفظ لفظ پڑھوں گا اور اُس پہ لکھوں گا۔''

احترام الحق نے دوسرے ہی دن اچھی طرح اپنے ناول کا مسودہ ایک مضبوط لفافے میں ڈال کر اُس پہ صغیرالقمر کا نام و پتہ لکھا۔ اُس کے بعد جنرل پوسٹ آفس میں آکر ڈھائی سو روپے کی ادائیگی کے بعد اسپیڈ پوسٹ سے ناول کا مسودہ ارسال کردیا۔ پوسٹ آفس والے نے اُسے رسید پکڑائی تو اُس نے پوچھا: ''بھائی صاحب یہ کب تک پہنچے گا؟''

''تین دن میں پہنچ جانا چاہیے''

ناول کا مسودہ ارسال کرنے کے ایک ہفتہ بعد صغیر القمر کا فون آیا کہ اُنھیں مسودہ موصول ہو چکا ہے۔ کوئی ڈیڑھ ماہ گزر جانے کے بعد جب ایک روز احترام الحیات نے صغیرالقمر کو فون کیا تو اُنھوں نے کہا:

''احترام! میرے دوست میں نے دراصل ابھی تک آپ کا ناول پڑھنا شروع نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک عالمی مشاعرے میں شرکت کے لئے جرمنی جارہا ہوں۔ وہاں سے واپس آکر ہی میں اسے پڑھنا شروع کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

کوئی تین ماہ گزر جانے کے بعد احترام الحیات نے ایک دن پھر صغیرالقمر کو فون پہ کہا: ''جناب مجھے اُمید ہے آپ نے میرا ناول پڑھ لیا ہوگا۔ میں آپ کے بصیرت افروز تنقیدی مضمون کے بغیر اسے چھپوانا نہیں چاہتا ہوں، اس لئے آپ سے میری استدعا ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے اپنا مضمون ارسال فرمائیں، نوازش ہوگی۔''

''احترام! میں معذرت خواہ ہوں۔ میری مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔ ان دنوں ایک قومی سیمینار کے لئے تحقیق پر مقالہ لکھ رہا ہوں۔ بس اُس سے فارغ ہوتے ہی آپ کے ناول کو پڑھنا شروع کروں گا اور پڑھنے کے فوراً بعد ایک جامع مضمون لکھ کے آپ کے نام و پتے پر ارسال کردوں گا۔ آپ کی طبیعت اُسے دیکھ کے خوش ہوجائے گی۔''

احترام الحیات نے اطمینان کی سانس لی:

''جناب آپ کی نوازش، میری سعادت مندی۔ مجھے آپ کے مضمون کا بیتابی سے انتظار رہے گا۔''

چھ ماہ کے بعد جب ایک روز ڈاکیے نے رجسٹرڈ لفافہ احترام الحیات کے ہاتھ میں پکڑانے کے بعد اُس سے ایک الگ کاغذ پہ دستخط لیا تو وہ بہت خوش ہوا، یہ سوچتے ہوئے کہ دیر سے ہی سہی آخر کار میرے ناول ''یہ کہاں آ گئے ہم'' پہ صغیرالقمر کا مضمون آ ہی گیا۔

اُس نے کمرے میں آکر بڑے شوق کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔ لفافے کے اندر صغیرالقمر نے اپنے لیٹر پیڈ پہ احترام الحیات کے ناول پہ کل ساڑھے آٹھ تعریفی جملے لکھے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کے احترام الحیات دیر تک بہت کچھ سوچتا رہا۔ اُس کے چہرے سے غم وغصے کے آثار نمایاں ہورہے تھے۔ اب وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ صغیرالقمر کے لکھے ان ساڑھے آٹھ جملوں والے کاغذ کو نذرِ آتش کرے یا اپنے ناول کے ابتدائی صفحات میں انھیں شامل کرے۔ ❁❁

قدرت کا بخشا ہوا اختیار

انسان اگر پے در پے تلخیوں سے دوچار ہوتا ہے تو اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور ایک حساس طبع انسان کے احساسات کی دنیا تو اور بھی اندھیری ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف بڑھتی پریشانیوں کو بے دریغ اپنے اوپر مسلط کر لیتا ہے، پھر یہ ویرانیاں اس کے ہر جذبے کو تھپک تھپک کر سلا دیتی ہیں، ایسے میں انسان عموماً تنہائی پسند ہوجاتا ہے، لیکن اگر یہی انسان خود اعتمادی اور مستقل مزاجی کو سامنے رکھ کر ان بڑھتی ہوئی پریشانیوں اور چار سو بکھری ہوئی اداسیوں اور مایوسیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور انہیں ختم کرنے کے لئے ان سے نبرد آزما ہوجائے، زندگی کے رنگین آئینے میں اپنا عکس تلاش کرنے کی کوشش کرے تو قطعی طور پر وہ کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے، عمیق و پرخطر سمندر کی تہہ سے اپنا گوہر مقصود نکال سکتا ہے۔ قدرت نے انسان کو یہی تو اختیار دیا ہے۔ جدوجہد اور عمل چاہے وہ کسی بھی مقصد کے لئے ہو، شادمانی وکامرانی یقینی ہے۔ (سلطانہ فخر کے ناول ''صبرین'' ۱۹۸۱ء، ص ۹۱ سے ماخوذ)

ڈاکٹر شاہین سلطانہ
22J, Gorachand Road, Flat 2A, 2nd Floor, Kolkata - 700014 (West Bengal)
(Mob.7604020067)

ویڈیو کال

مسز شرجیل کو بے پناہ شوق تھا کہ ان کا اکلوتا بیٹا، ان کی آنکھوں کا تارا وقار عظیم امریکہ میں کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جائے۔ شرجیل صاحب کا کاروبار اگرچہ اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ وقار کو کہیں ملازمت کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، لیکن معلوم نہیں کیوں مسز شرجیل اٹھتے بیٹھتے امریکہ کی ہی تعریف کرتیں اور جب وقار نے کمپیوٹر انجیرنگ اور ایم۔بی۔اے کی تعلیم مکمل کر کے امریکہ میں کسی نامور سافٹ ویئر کمپنی میں اپنی ملازمت کا اعلان کیا تو وہ خوشی سے ایسے کھل اٹھیں جیسے کہ ملازمت ان کو ہی ملی ہو۔

وقار عظیم کے پھول سے گالوں کو کبھی چومتیں، کبھی اس کے نرم و نازک بالوں میں انگلیاں پھیرتیں، کبھی اپنا سر اس کے مضبوط شانوں پر رکھ کر خوشی کے آنسو بہاتیں۔فون کا سلسلہ تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دوست، رشتے دار، پڑوسی سب ان کی خوشی میں شامل تھے اور ایک حسین تقریب کا سبھوں کو انتظار تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ شرجیل صاحب اور ان کی اہلیہ کو دعوتیں کرنے اور ان کے انتظامات میں کافی لطف آتا تھا۔ روپے پیسے کی تو کوئی کمی تھی نہیں اور اللہ تعالیٰ نے نیک دل بھی عطا کیا تھا۔ اپنے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنا اور ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہونا دونوں کو بے حد پسند تھا۔

تقریب کی شام سرخ لباس میں مسز شرجیل واقعی سب سے حسین لگ رہی تھیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، دل جب خوش ہو تو چہرے پر خود بخود شادابی آجاتی ہے۔ خوشی سے مسرور، شوہر اور بیٹے کے ساتھ خرامِ ناز سے ہر ایک کو خوش آمدید کہتے ہوئے وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت ماں نظر آرہی تھیں۔

وقار عظیم اپنے نام کی طرح ہی بے پناہ پر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ دولت اور شان و شوکت نے انہیں اور بھی زیادہ حلیم بنا دیا تھا۔ اردو غزل کے معشوق کی طرح پلکیں کبھی مکمل اٹھتی ہی نہیں تھیں، لب کبھی مکمل طور سے وا ہوئے ہی نہیں تھے۔ پاکیزہ جبیں، پھر سجی ہوئی حسین زلفیں، ہر ایک کو مسحور کرنے کے لئے کافی تھیں۔ لوگوں کے ہجوم میں کھڑے شرجیل صاحب کی آنکھیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ دل خدا کا بار بار شکریہ ادا کر رہا ہے۔ نہایت متین انداز میں کبھی بیوی کو دیکھتے اور کبھی بیٹے کو۔ یہ اور بات ہے کہ بیٹے کی طرف نظریں بار بار طواف کرنا چاہتی تھیں۔

وقار عظیم بھی اپنے دوستوں کو لئے کبھی اپنے والد کی طرف جاتے اور کبھی اپنی مما کی طرف۔ والدین کی بے پناہ محبت اور شفقت کے سائبان میں پرورش پانے کے نور و سرور سے چمکتا وقار عظیم کا چہرہ کسی کی بھی آنکھوں میں رشک کے جذبات بیدار کر دینے کے لئے کافی تھا۔ آخر کار سبھوں کی ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ شاندار تقریب ختم ہوئی اور کل کچھ مخصوص دوستوں اور رشتے داروں نے ائیر پورٹ پر آنے کا وعدہ بھی کیا اور پھر سب آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے۔

مسز شرجیل نے وقار عظیم کے سفر کی تیاریاں ایک ہفتے پہلے ہی مکمل کر لی تھیں۔ کافی رات تک دونوں وقار عظیم کے دائیں اور بائیں جانب بیٹھے رہے۔ ہجر کے لمحات قریب سے قریب تر آتے جا رہے تھے، شرجیل صاحب تو ایک روز کے لئے بھی وقار عظیم سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ امریکہ بھیجنے کی خواہش صرف مسز شرجیل کی تھی اور وہ خواہش بھی کوئی معمولی خواہش نہ تھی بلکہ شدید گہری خواہش تھی، جو پوری نہ ہوتی تو شاید وہ زندگی بھر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتیں۔ نہ جانے آج کی ماؤں کے لئے امریکہ کی خواہش اس قدر شدید سے شدید تر کیوں ہوتی جا رہی ہے۔

ائیر پورٹ پر بھی وقار عظیم کو الوداع کہنے کے لئے کافی

دوست احباب جمع تھے۔ شرجیل صاحب اور مسز شرجیل نے بیٹے کو گلے لگایا تو آنکھیں دل کا ساتھ نہ دے پائیں۔ دونوں معصوم بچوں کی طرح سسکیاں بھرنے لگے۔ دل کا بس چلتا تو ایسی چیخ نکلتی جو شاید امریکہ تک سنائی دیتی، لیکن دل تو اپنا کام جانتا ہے۔ دل نے آنکھوں کو اجازت دے رکھی تھی، صحیح وقت پر آنسوؤں کو رواں دواں ہو جانے کی اور آنکھیں بھلا دل کی بات کب نہیں مانتیں، وہ برستی رہیں، برستی رہیں، کسی نے جب کاندھے پر ہاتھ رکھا اور گاڑی کی طرف اشارہ کیا تو وہ شوہر کا ہاتھ تھامے نہایت آہستگی سے چل کر گاڑی میں آ بیٹھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وقار عظیم اپنے ساتھ اپنی مما کی خرامِ ناز بھی لے گئے۔

دونوں گھر پہنچے ہی تھے کہ وقار کی کال آ گئی۔ ویڈیو کال پر دونوں بیٹے کو دیکھتے رہے، صرف چھو نہیں پا رہے تھے۔ مسز شرجیل کا بس نہیں چلتا کہ وہ وقار کو سینے سے لگالیں اور پھر وقار نے یہ کہہ کر ویڈیو کال بند کر دی کہ اب بورڈنگ شروع ہو گئی ہے اور اب امریکہ پہنچ کر بات ہو گی۔

دوسرے روز وقار عظیم کی نہایت پرجوش آواز سنائی دی:

''مام، ڈیڈ...... میں آفس میں ہوں...... بے حد شاندار آفس ہے مما...... ٹینس کورٹ بھی ہے، میں ہر شام یہاں بھی ٹینس کھیل لیا کروں گا...... اور......''

وقار عظیم نہ جانے کیا کیا سناتے رہے اور دونوں نہ جانے کہاں کھوئے رہے، آخر میں صرف یہ سنائی دیا:

''مما! میں آپ کو کل فون کروں گا! او کے مما، ٹیک کیئر......''

مسز شرجیل کے لئے فون جیسے ان کے گلے کا سب سے حسین زیور بن گیا تھا، ہر وقت انگلیاں اور نظریں فون پر لگی رہتیں۔ نہ جانے کب شرجیل صاحب سے وہ محو گفتگو ہوں اور بیٹے کا فون سنائی نہ دے۔ شرجیل صاحب اکثر مذاق بھی کرتے:

''اب مجھے اور زیورات خریدنے کی ضرورت ہی نہیں، گلے میں ہر وقت جھولتا، ڈولتا، مچلتا یہ موبائیل فون تمہارے حسن کی معصومیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔''

وقار عظیم کے کال کے انتظار میں وہ گھنٹوں یوں ہی بیٹھی رہتی تھیں۔ اگر وہ فون بھی کرتا تو بہت جلدی میں ہوتا۔ مسز شرجیل اسے ویڈیو کال کرنے کو کہتیں تو وہ وقت کی کمی کا بہانہ کر کے فون منقطع کر دیتا۔ اب تو ہفتے میں ایک دو بار ہی وقار کی آواز سنائی دیتی۔ شرجیل صاحب کا دل اندر اندر ہی آنسو بہاتا رہتا۔ مسز شرجیل کو کھوئے کھوئے انداز میں دیکھتے تو ان کی آنکھیں بھر آتیں۔ شرجیل صاحب سب سمجھتے اور ہر حال میں انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے، لیکن بیٹے کا غم انہیں اندر ہی اندر مسز شرجیل کھائے جا رہا تھا۔

اسی طرح شب و روز گزرتے رہے، ویڈیو کال تو دور کی بات اب تو وقار کا فون بھی کبھی کبھی آتا اور ''آل فائن مما'' کہہ کر کٹ جاتا۔ مما کے دل کا حال جاننے کی فرصت کہاں تھیں اب وقار کو۔ اچانک سے مسز شرجیل ''ویڈیو کال! ویڈیو کال'' چیخنے لگیں اور ان کی اس زوردار آواز کو سن کر شرجیل صاحب بھی دوڑے بھاگے ان کے قریب آ گئے۔

''وقار! وقار! اب ہم سے ملنے آ جاؤ وقار! بہت عرصہ ہو گیا تمہیں گلے لگائے۔ تمہارے پاس بیٹھے، آ جاؤ پلیز!''

''مما آ جاؤں گا! آپ ان کو دیکھیں مما۔ یہ ہیں شیریں آئرین، کل بہت جلدی میں ہم دونوں نے شادی کر لی ہے۔ میں بہت جلد اسے ہندوستان لے کر آؤں گا۔ آپ دیکھ لیں مما! آپ کو میری دلہن پسند آئی نا مما؟ آپ کی طرح ہی بے حد حسین، بہت کیوٹ ہے مما......''

''ہیلو آنٹی! میں شیریں آئرین ہوں۔ وقار آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ہم لوگ بہت جلد انڈیا آئیں گے۔ ٹیک کیئر۔''

فون کٹ چکا تھا۔ مسز شرجیل، شرجیل صاحب سے لپٹ کر گھنٹوں روتی رہیں۔ بنا آواز دلخراش انداز میں آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ شرجیل صاحب کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

مسز شرجیل کو اب خوفناک خواب آنے لگے، ڈاکٹروں نے نیند کی دوائیاں لکھ دی تھیں، مگر نیند کی گولیوں کا اثر ختم ہوتے ہی وہ چیخنے لگتیں:

''میرا فون، میرا فون، وقار کا ویڈیو کال......'' اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہتیں۔ شرجیل صاحب خاموش سب کچھ دیکھتے رہتے۔

مہینے سال میں تبدیل ہوتے گئے، گرین کارڈ ملنے کے شرائط اور تمام مجبوریوں کا ذکر کرتے کرتے وقار کو پانچ سال ہو گئے۔ مما سے ملنے آنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ وقار کے دو پیارے پیارے

بچے کبھی کبھی مسز شرجیل کو ویڈیو کال پر نظر آتے۔ کبھی ''ہائے'' کہتے اور کبھی ''بائے'' کہتے۔ کبھی گرانڈ ماں کہتے اور کبھی مما کہتے، کبھی وہ مسکراتے اور کبھی زور زور سے تالیاں بجاتے، لیکن مسز شرجیل صرف پھوٹ پھوٹ کر روتیں۔ ویڈیو کال بھی کتنی عجیب چیز ہے۔ یہ رشتوں کو آخر کہاں سے کہاں تک کا سفر کرادیتی ہے۔

مسز شرجیل کی طبیعت اب بہت زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ اب انہیں ویڈیو کال میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ موبائیل کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھیں۔

ہر وقت ''وقار میرا بچہ، میرا چندا.....'' ایسی ہی آوازوں سے ''خلدولا'' گونجتا رہتا۔ جب نیند کی دواؤں کا اثر ہوتا تو ''وقار، وقار، وقار.....'' کی آواز مدھم پڑجاتی اور پھر وہی درد بھری آواز میں وقار کو یوں صدادیتی رہتیں کہ ممتا کی تڑپ سے نوکروں کے بھی دل دہل جاتے۔

ایک روز اچانک فون کی گھنٹی بجی اور اس سے پہلے کہ مسز شرجیل ''ویڈیو کال، ویڈیو کال، ویڈیو کال ......'' کی آواز لگا کر جنونی انداز میں پکارتیں، شرجیل صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور موبائیل کو اس قدر زور سے کھڑکی کے باہر پھینک دیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ موبائیل فون نہیں بلکہ کوئی ایٹم بم ہے جس کے ایٹمی دھماکے کے پہلے ہی وہ اپنی اور اپنی بیوی کی جان بچالینا چاہتے ہوں۔

اس کے بعد وہ نہایت سکون سے چلتے ہوئے دریچے کے قریب گئے اوران کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ موبائیل کے کم وبیش تین چار ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

''خلدولا'' سے اب بھی وہی آواز آئی آرہی تھی۔

''ویڈیو کال، ویڈیو کال، میرا وقار......وقار......وقار......''

نہ جانے یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ ❁❁

ایہام اور اس کی قسمیں

ایہام، اُس شک وشبہ کے معنی میں ہے جس میں ذہن دو یا دو سے زیادہ مطلب کے بارے میں یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ ان میں کون سا درست یا کون سا مقصود ہے۔ علم بلاغت کی اصطلاح میں ایہام کا مترادف ''توریہ'' ہے یعنی کلام میں دو معنی ہوں۔ ایک قریب اور ایک بعید اور مصنف نے بعید معنی مراد لئے ہوں۔ یہ صنعت ایسے لفظوں کی مدد سے پیدا کی جاتی ہے جن کے دو یا دو سے زیادہ لغوی معنی ہوں، لکھنے والا ایک معنی مراد لے، مگر پڑھنے والے کو دوسرے معنی کا بھی وہم ہوجائے مثلاً ''فسانہ عجائب'' کا ایک فقرہ ہے ''کنویں جن کی چاہ میں باولی دیوانی ہوجائے'' اس فقرے میں کنویں کی رعایت سے چاہ اور باولی کی رعایت سے دیوانی کا استعمال کیا گیا ہے۔ چاہ سے چاہت بھی مراد ہوسکتی ہے اور کنواں بھی اس لئے کہ فارسی میں چاہ کنوئیں کو کہتے ہیں، اسی طرح باولی سے مراد کوئی پاگل دیوانی عورت بھی ہوسکتی ہے اور وہ کنواں بھی جس میں پانی تک اترنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوں۔ عام طور پر ایہام گوئی کو پسند نہیں کیا جاتا اور کہا جاتا ہے ؎

ضرورت آج ہے صنعت کی ، طبعی کی ، ریاضی کی　　　　کہیں ایہام کی صنعت سے فکر آب و ناں ہوگا

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میرؔ وغالبؔ جیسے شعرا کے یہاں صنعت ایہام کے کثرت استعمال اور حسن استعمال کی مثالیں ملتی ہیں۔ اکثر بے احتیاطی کی وجہ سے ایک معنی کی جگہ دو یا تین معنی پیدا ہوجاتے ہیں، لیکن ایہام کا یہ مفہوم نہیں ہے، بلکہ اس اصطلاح سے شعر میں زبان کی اس گہرائی اور لطافت کی طرف اشارہ ہے جس میں لفظوں کا ہلکا سا شائبہ یا باریک فرق بھی ایک شعر سے مختلف ردّعمل کا باعث ہوتا ہے۔ EMPSON نے ایہام کی سات قسمیں بتاتی ہیں۔ (۱) کوئی لفظ یا ترکیب نحوی ایک سے زیادہ طریقوں میں موثر ہوسکتا ہے یا ہوسکتی ہے۔ (۲) مصنف کا ایک معنی دو یا زیادہ معنوں سے مرکب ہوسکتا ہے۔ (۳) ذومعنی لفظ کے استعمال سے بیک وقت دو خیال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ (۴) کسی شعر کے مختلف معانی سے شاعر کے دماغ کی پیچ در پیچ کیفیت ظاہر ہوسکتی ہے۔ (۵) کوئی شبیہ یا نقش دو خیالوں کے درمیان واقع ہوسکتا ہے۔ (۶) شعر میں تضاد ہوسکتا ہے اور (۷) دو معنوں میں تضاد ہو تو ان سے شاعر کے دماغ کا بنیادی تضاد ظاہر ہوتا ہے۔ (ماخوذ)

منظومات

محمد مصطفےٰ غزآلی

Belwarganj, Dabgar Toli More, Near Pollo Hospital,Patna City
Patna - 800007 (Mob. 9798993200)

نعت پاک

نبی پر جو ایمان ہیں لانے والے
وہی ہیں خدا کی رضا پانے والے

نگاہِ کرم ہو ہماری طرف بھی
سبھی کی مرادوں کو بر لانے والے

خدایا کرم ہو محمد کے صدقے
کہ ہم ہیں انہیں کی وفا پانے والے

کبھی اک نظر ہو شہنشاہِ عالم
سبھی کے نصیبہ کو چمکانے والے

فلک کے ستارے ، زمیں کے نظارے
چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے

قمر ، کہکشاں ، آفتاب و کواکب
سبھی ہیں نبی سے ضیا پانے والے

نہ چھوڑیں کبھی اتباعِ محمد
کہ تھک جائیں گے خود ستم ڈھانے والے

لبوں پر رہے گا سدا ذکر احمد
کروڑوں ہیں نعت نبی گانے والے

نبی کی اطاعت نہ چھوٹے گی ہرگز
ہزار آئیں بہکانے ، دھمکانے والے

انہیں بھی عطا ہو نبی کی محبت
جو اغیار اب تک ہیں پچھتانے والے

ملے گی نوید شفاعت انہیں کو
عمل میں جو سنت کو ہیں لانے والے

خدا کی قسم ہو گئے جو نبی کے
وہی فیض و انعام ہیں پانے والے

سلامِ غزآلی ذرا جا کے کہنا
درِ شاہِ بطحا پہ او جانے والے

❀❀❀

سرورِ عالم

مختآر جعفری

آؤ مدد کو احمد مرسل ، رحم کرو سرکار دو عالم
حامد و احمد اور محمد ، مولیٰ ہمارا مردِ مکرم
گم کردہ رہ کو راہ دکھا دو ، ہمرہ ہو کر راہ لگا دو
کردو مہم سر آ کر سرور ، ہم کو دلادو لولو و گوہر
مولیٰ مالک ہر دو سرا ہو ، مولیٰ اس محروم گدا کو

کردو درد دل کا مداوا ، لادو مولیٰ درد کا مرہم
طاہر و اطہر اور مطہر مولیٰ ہمارا اکمل و اعلم
ہم کو کلام اللہ سکھا دو ، کر دو ہمارا علم مسلم
مولیٰ ہو ممدوح داور ، مولیٰ ہو اللہ کے محرم
للہ حصہ رحم عطا ہو ، کردو مدد ہمدرد و ہمدم

مدثر عمر کیفی

Saba House, Daccan Mohalla, Piro 802207 Bhojpur (Bihar)
(Mob. 8709838916)

تین نظمیں

چاند کی باتیں

میری آنکھیں
تکتی رہتی ہیں اس جانب
جب رات
اپنی پوری
آب وتاب کے ساتھ
سمٹ جاتی ہے
اک خوبصورت منظر لئے
یاد دلاتی ہے
ماضی کی
یہ آسماں پر چمکتا ہوا چاند
میری محبوبہ کی
یاد دلاتا ہے
جو چودھویں کے
چاند کی طرح
اپنا بھیس بدلتی رہتی تھی
لیکن اچانک
میری زندگی میں
اک طوفان آیا
اور میری زندگی کا
شیرازہ ہی بکھر گیا
لیکن یہ چاند
اپنی جگہ پر
آج تک
قائم ودائم ہے
اور محشر تک رہے گا
صرف چاند

خوابوں کی حقیقت

ہر شب
میں ایک نیا
خواب
بنتا رہتا ہوں
نہ جانے کیوں
مجھے
اپنی آنکھوں پر
یقیں نہیں آتا
کیا ان خوابوں سے
میری زندگی
سنور سکتی ہے
نہیں
تو پھر یہ خواب
زمین کی طرح
میرے چاروں طرف
کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں
آخر
کچھ تو بات ضرور ہوگی
میں اپنے خوابوں کی تعبیر
جاننے کے لئے
بیتاب رہتا ہوں
اچانک میری آنکھیں
کھل جاتی ہیں
کیا یہی ہے
خوابوں کی حقیقت

آرزو کا کنول

وہ شب کی
تاریکیوں میں
ہر روز
اپنے ہاتھ اٹھائے
دعائیں مانگ رہا ہے
شاید اس
امید میں کہ
ایک نہ ایک دن
اس کی ساری
حسرتیں
پوری ہو جائیں گی
اور اس کو
سب کچھ مل جائے گا
اور اس کی
آرزوؤں کا کنول
کھل جائے گا

❀❀❀

غزلیں

سردار پنچھی

Jethi Nagar, Malerkotla Road, Khanna - 141401
(Punjab) (Mob. 9417091668)

دیکھنا ہو مسکرا کے دیکھئے
آنکھوں سے آنکھیں ملا کے دیکھئے

ہوگی روشن ازدواجی زندگی
پیار کا دیپک جلا کے دیکھئے

آپ کے لب شہد کے ہو جائیں گے
نام لے میرا بلا کے دیکھئے

پھول خندہ زن ہے اچھا دیکھنا
یوں ہی خود کو بھی سجا کے دیکھئے

آپسی شکوے رفع ہو جائیں گے
اشک آنکھوں سے بہا کے دیکھئے

ہوگی یہ کامل زیارت عشقیہ
اُن کے کوچے میں تو جا کے دیکھئے

آپ کا دست حنائی ہے عظیم
پنچھی کے پر پر لگا کے دیکھئے

❀❀❀

فردوس گیاوی

Arif Nagar, Gewal Bigha, Gaya - 823001
(Mob. 9546037777)

ڈر جائے گی یہ رات اگر بولتا رہا
میری صدا کو سن کے کھنڈر بولتا رہا

کچھ کام کر نہ پائیں دوائیں طبیب کی
تیری دعا کا اس میں اثر بولتا رہا

دونوں کی تار تار تھی آوازِ اعتبار
دیوار تھی خموش تو در بولتا رہا

ٹھہرا تھا میں تو ٹھہری ہوئی کائنات تھی
مجھ میں رواں مرا ہی ہنر بولتا رہا

اُس کی صدا سے شہر میں ہلچل سی مچ گئی
وہ چپ ہوا تو سارا نگر بولتا رہا

پاس و لحاظ کچھ بھی نہیں رہ گیا کہیں
فردوس چپ تھا ، لختِ جگر بولتا رہا

❀❀❀

جمیل احمد جمیلؔ

139/295, Deen Dayal Road, Asharfabad, Lucknow
(Uttar Pradesh) (Mob. 9415780888)

غزلیں

زمیں پہ ہیں کہ وہ بالائے آسماں پہنچے
خبر تو لیجئے دیوانے اب کہاں پہنچے

حصولِ رزق تلاشِ معاش کی خاطر
کہاں کہاں نہیں بھٹکے کہاں کہاں پہنچے

وہیں وہیں پہ پڑیں حادثوں کی بنیادیں
سفید پوش جہاں بھی یہ حکمراں پہنچے

بھنور سے اس نے پکارا تو کہہ کے ہم لبیک
کنارہ چھوڑ کے طوفاں کے درمیاں پہنچے

نصیحتیں ہیں ہمیں مے کشوں کو اے ناصح
خدا کرے ترے کانوں میں بھی اذاں پہنچے

مشاہدہ ہے ، شکم سیر مسکراتے ہیں
کسی کی آنکھ میں غربت کا جب دھواں پہنچے

جمیلؔ اتنی کشش کب ہے شوقِ سجدہ میں
تری جبیں کے لئے سنگ آستاں پہنچے

❁❁❁

اک زخم بے وفائی جو تیرا شریک ہے
دل کے چمن میں تیری عطا بھی شریک ہے

لوٹا گیا جو راہِ محبت میں قافلہ
اس رہزنی میں راہ نما بھی شریک ہے

ہے بھیڑ تیرے ساتھ تو تنہا نہ مجھ کو جان
میرے سفر میں میرا خدا بھی شریک ہے

میں ایک زندہ لاش کی صورت ہوں اس لئے
میرے لہو میں زہر انا بھی شریک ہے

یونہی نہیں بجھائے گئے ہیں مرے چراغ
ان سازشوں کے ساتھ ہوا بھی شریک ہے

آزاد کر کے کر لیا تو نے اسیر عشق
تیری عنایتوں میں سزا بھی شریک ہے

میں کامیاب اس لئے ہوتا گیا جمیلؔ
محنت کے ساتھ ماں کی دعا بھی شریک ہے

❁❁❁

اشعار زیبا

کھلتا ہے ہر اک غنچۂ نو جوشِ نمو سے
یہ سچ ہے ، مگر لمس ہوا بھی ہے کوئی چیز (ساحرؔ)

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پر منزل کا گماں ہوتا ہے (تاباںؔ)

اُجالوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا
بہت دور تک رات ہی رات ہوگی (بشیر بدرؔ)

فکر کے دریچے تک کھولتا نہیں کوئی
آج ذہن انساں پر ایسا خوف طاری ہے (نامعلوم)

جاوید رانا

143/29, Near Chaar Mazaar, Dr. Zakir Hussain Ward Mominpura
Burhanpur - 450331 (Madhya Pradesh)

غزلیں

چمکنا جا بہ جا اور پھر وہی ظلمات میں رہنا
مقدر جگنوؤں کا ہے اندھیری رات میں رہنا
تو سورج سے اُلجھتا ہے چراغوں کے سہاروں پر
تری اوقات اتنی ہے تو پھر اوقات میں رہنا
مزاج اپنا سدا رکھتے ہیں پھولوں کی طرح شاداں
ہمیں آتا نہیں تیری طرح جذبات میں رہنا
کبھی میں دھوپ کی بارش کبھی صحرا میں رہتا ہوں
گوارا ہو اگر تم کو تو میرے ساتھ میں رہنا
بچا لینا زمانے کی بری نظروں سے خود کو تم
مری غزلوں میں چھپ جانا مرے نغمات میں رہنا
ابھی تو اور بہت سے پیچ وخم آئیں گے دنیا میں
ابھی سے تم سلگتے چیختے حالات میں رہنا
بھٹک جائے نہ کوئی بھی مسافر راستہ اپنا
چراغوں کی طرح جلنا اندھیری رات میں رہنا

❁❁❁

صبا بھی مہکے گی رنگ بہار ٹھہرے گا
تم آؤ گے تو دلِ بے قرار ٹھہرے گا
بتوں سے پاک کرو اپنے دل کے تہہ خانے
تب اس مکان میں پروردگار ٹھہرے گا
یہ چاند ساری چمک بھول جائے گا اپنی
تمہاری چھت پہ اگر ایک بار ٹھہرے گا
اے مہ جبیں یہ گلابوں کا سرخ پیراہن
ترے بدن پہ بہت شاندار ٹھہرے گا
وہاں کی خاک سے پھوٹیں گے نور کے چشمے
جہاں جہاں بھی تہجد گزار ٹھہرے گا
یہاں پہ کام نہیں بے وقوف لوگوں کا
یہ میکدہ ہے یہاں ہوشیار ٹھہرے گا
نہ روک پاؤگے اُڑنے سے تم ہمیں راناؔ
فلک پہ جاکے ہی اب یہ غبار ٹھہرے گا

❁❁❁

آنکھیں

ساحرؔلدھیانوی

ہر طرح کے جذبات کا اعلان ہیں آنکھیں
آنکھوں سے بڑی کوئی ترازو نہیں ہوتی
آنکھیں ہی ملاتی ہیں زمانے میں دلوں کو
لب کچھ بھی کہیں اس سے حقیقت نہیں کھلتی
آنکھیں نہ جھکیں تیری کسی غیر کے آگے
شبنم، کبھی شعلہ، کبھی طوفان ہیں آنکھیں
تلتا ہے بشر جس میں وہ میزان ہیں آنکھیں
انجان ہیں ہم تم اگر انجان ہیں ہیں آنکھیں
انسان کے سچ جھوٹ کی پہچان ہیں آنکھیں
دنیا میں بڑی چیز میری جان ہیں آنکھیں

غزلیں

ڈاکٹر احمد منظورؔ

H.No.9, Alamdar Colony, Chandsumma Kanispora
P.o. Khawajabagh - 193103 (J&K) (Mob. 7006345309)

عقیدتوں کا حسیں آئینہ سمجھتے ہیں
تمہاری رائے کو ہم فیصلہ سمجھتے ہیں

بہت ہجوم ہے زخموں کا میرے سینے میں
اور ایک دل ہے جسے آبلہ سمجھتے ہیں

خلش اُسے بھی بچھڑنے کی ہے ہماری طرح
اسی گمان کو دل کی دوا سمجھتے ہیں

انہی کے سر ہے فریضہ ہمیں سمجھنے کا
جو مستطیل کو بھی دائرہ سمجھتے ہیں

دلیل اور ہو کیا ہم سیاہ بختوں کی
وہی غلط ہے جسے رہنما سمجھتے ہیں

تمہیں قسم ہے کہیں ہم سے چھین مت لینا
یہ ہم نوائی جو ہم حوصلہ سمجھتے ہیں

محبتوں میں بٹھایا جو ان کو پلکوں پر
انہیں غرور ، انہیں ہم خدا سمجھتے ہیں

وفا شعار بہت کم ہی ایسے ہوتے ہیں
جو ایک شخص کو بھی قافلہ سمجھتے ہیں

ترے ضمیر کی فطرت جدا تو ہے منظورؔ
ترا مزاج مگر باخدا سمجھتے ہیں

❀❀❀

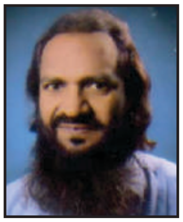

مظہرؔ زاہدی

Loharwaghat Lane, Alamganj, Patna - 800007
(Bihar) (Mob. 9934410620)

پھیر کر چہرہ جا رہا تھا وہ
دردِ الفت کا آسرا تھا وہ

اب بھی روشن ہے میری آنکھوں میں
جانے کب خواب میں ملا تھا وہ

جس نے مجھ کو بھنور میں چھوڑ دیا
میری کشتی کا ناخدا تھا وہ

حیف سب کچھ اسی نے لوٹا ہے
میرا دلبر تھا ، رہ نما تھا وہ

میرے قد سے بڑا تھا جس کا قد
غیروں کے پاؤں پر کھڑا تھا وہ

جانے گرمی تھی کس کی یادوں کی
صورتِ شمع جل رہا تھا وہ

جامِ الفت پلا کے مظہرؔ کو
جان و دل میں سما گیا تھا وہ

❀❀❀

غزلیں

ڈاکٹر تبسم فرحانہ

H.O.D. Home Science, Mirza Ghalib College,
Gaya- 823001 (Mob. 9430056678)

جو لگی ہے چوٹ دل پر وہ دکھاؤں کس کو جا کے
بس اُنہیں کے ہیں موافق مرا رُخ بچا بچا کے
میرے ذوقِ جستجو نے وہ دکھائے ہیں کرشمے
کبھی پا لیا ہے کھو کے کبھی کھو دیا ہے پا کے
نہیں کھیل برف دوراں انہیں راہ سے ہٹانا
جو چمن سجا رہے ہیں غم آشیاں مٹا کے
کوئی صبح کے اُجالوں سے بھی جگمگا نہ پایا
میں تو تیرگی میں تاباں ہوں چراغِ دل جلا کے
میں سنا نہ پاؤں تو کیا غم عشق کی کہانی
مرے دل کو جیت لے گا کوئی نظم وہ سنا کے
تیرے ہر ستم پہ قرباں مرے جان و دل یہ ہوں گے
ذرا دیکھ لے اے ظالم مرا صبر آزما کے
ہیں کہیں شفق تبسم کہیں سرخ ابر پارے
یہ جو ہیں فلک پہ ٹکرے مرے دامن وفا کے

❀❀❀

سمیع احمد ثمر

Vill. Shree Rampur, P.o. Mahamedpur, P.s. Manjhi
Dist. Saran - 841223 (Mob. 7488820892)

راہِ وفا میں ملتے ہیں غم بھی خوشی کے ساتھ
نادان دل کو کیسے لگائیں کسی کے ساتھ
الفت کے واسطے تو زمانہ جئے مگر
سیکھا ہے ہم نے مرنا فقط عاشقی کے ساتھ
مشکل کے دور میں نہ کبھی ساتھ چھوڑنا
ہم تیرے ساتھ تب بھی رہیں گے خوشی کے ساتھ
اردو ادب سے کیوں نہ محبت کروں بھلا
شہرت جڑی ہوئی ہے مری شاعری کے ساتھ
الفت اسے میں سمجھوں یا مجبور ہے کوئی
ملنے کو آئے ہم سے مگر بے دلی کے ساتھ
آپس میں جب خیال کبھی مل نہیں سکے
کیسے نباہ ہوگا بھلا اجنبی کے ساتھ
کچھ ایسے لوگ اپنوں میں مل جائیں گے تجھے
اپنا بنا کے کھیلیں گے جو زندگی کے ساتھ
جس کی محبتوں پہ ہمیں ناز تھا ثمر
رخصت وہ کر رہا ہے ہمیں بے رُخی کے ساتھ

❀❀❀

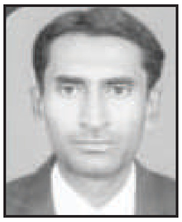

اظہار الحق اظہرؔ

Chandpur Fatah, Pateypur, Vaishali - 843102(Mob. 9304999130)

غزل

کس جگہ پر خدا نہیں ہوتا ۔۔۔ بندے سے رب جدا نہیں ہوتا
دور جتنا خراب ہو جائے ۔۔۔ با حیا بے حیا نہیں ہوتا
لاکھ کوشش کرو زمانے میں ۔۔۔ قرض ماں کا ادا نہیں ہوتا
اپنی دولت پہ یوں نہ اتراؤ ۔۔۔ وقت یکساں سدا نہیں ہوتا
نیک بیٹا تو مشکلوں میں بھی ۔۔۔ باپ ماں سے خفا نہیں ہوتا
ایسی کچھ بات ہے ترے اندر ۔۔۔ کام تیرے بنا نہیں ہوتا
یہ تو سچ ہے مشاہدہ کر لو ۔۔۔ ہر بشر پارسا نہیں ہوتا

دشمنی بھائی سے جو کرتا ہے
اُس کا اظہرؔ بھلا نہیں ہوتا

❀❀❀

خواتین کے اشعار زیبا

نہیں تھا گر تصور یار کا اے دل تو پھر کیا تھا ۔۔۔ ہوئی تصویر کیسے آہ آتش بار سے پیدا (جمیلہؔ)
رنگینئ نظر کی مرے داد دیجئے ۔۔۔ تھے تو حسین آپ ، مگر اس قدر کہاں (نرملا دیویؔ)
خزاں میں دعوت جشن بہاراں لے کے آئی ہوں ۔۔۔ بہ فیض دل چمن بندی کا ساماں لے کے آئی ہوں (شکیلہؔ)
اُن سے کہہ دو کہ ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی ۔۔۔ وعدہ ہم سے ہو ، رہو غیر کے گھر وصل کی رات (حجابؔ)
میرے کہنے سے نہ آ ، میرے بلانے سے نہ آ ۔۔۔ لیکن تاروں بھری رات کی توہین نہ کر (شکیلہؔ بھوپالی)
کیا بلا عشق ہے جیتی ہوں تو بدنام ہوں میں ۔۔۔ اور مرتی ہوں تو اُس شوخ کی رسوائی ہے (مشتریؔ)
ایک دن وہ تھا کہ کھو جاتے تھے ذوقِ عشق میں ۔۔۔ اب محبت کے تصور سے بھی گھبراتا ہے دل (سکینہؔ محمود)
وہ سامنے منزل کے نظر آتے ہیں آثار ۔۔۔ اے پائے شکستہ یوں ہی بس چند قدم اور (نیلوفرؔ ناہید)
آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ۔۔۔ آج اپنے غم کا اندازہ ہوا (یادؔ)

نام کتاب	:	ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں
مرتب	:	صفدر امام قادری
ناشر	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۳ء
صفحات	:	۵۲۸ قیمت : ۶۵۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر اے کے علوی

علمی اور ادبی سمینار کے انعقاد کی اہمیت وضرورت مسلم ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ جب سمینار کے مقالے کتابی شکل میں منظر عام پر آتے ہیں، تب ہی ان کی افادیت دیرپا اور دوررس ہو پاتی ہے۔ شکر اور خوشی کا مقام ہے کہ حالیہ دہائیوں میں سمینار کے مقالوں کی اشاعت کا رجحان عموماً بڑھ رہا ہے۔ اس کا تازہ ثبوت میرے مطالعہ کی میز پر رکھی ہوئی ایک ضخیم، خوبصورت اور نفیس کتاب ہے۔ اپنے موضوع کو مبرہن کر دینے والی اس جامع کتاب کا نام ہے ''ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں'' اور اسے جس ادبی شخصیت نے ترتیب دیا ہے، وہ علمی دنیا میں صفدر امام قادری کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ آپ عالمی شہرت یافتہ تنقید نگار، کالم نگار، نثر نگار، ادیب اور محقق ہیں۔

آج کے دور میں یوں تو سمینار کا انعقاد بھی ہوتا رہتا ہے اور اس کے مقالات بھی چھپتے رہتے ہیں، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے وہ ذرا تکلف سے ہی سمینار کے مقالوں کا خالص مجموعہ کہلانے کے حق دار ہوتے ہیں، وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں کبھی دانستہ طور پر اور کبھی محض شوقیہ انداز سے اخباری روئیداد، تصویری اوراق اور دیگر رسومیات کی خاصی آمیزش کر دی جاتی ہے، مگر یہاں جو بات پہلی ہی نظر میں متوجہ کر لیتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کتاب میں رنگین سرورق اور پس ورق کے علاوہ اگر چہ کہیں کوئی چہرہ کیمرے سے لی گئی تصویر میں نہیں دکھایا گیا ہے، لیکن ورق ورق، نوع بہ نوع کینوس پر سبھی چہرے لفظوں سے بنی اور بنائی گئی اور خلوص کے رنگوں سے بھری تصویر میں بالکل آئینہ کر دیے گئے ہیں اور یقیناً یہ وطیرہ خالص علمی وطیرۂ تدوین ہے۔

اس کتاب کا آغاز ''عرض مرتب'' سے ہوا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص منصوبہ کے تحت تیار نہیں ہوئی بلکہ یہ اس مبارک فیصلہ کا بہت ہی کم وقت میں سامنے آنے والا علمی ثمرہ ہے جو ڈاکٹر ظفر کمالی کو ادب اطفال کے لئے ساہتیہ اکادمی انعام ملنے کی خوشی میں ''بزم صدف انٹرنیشنل'' کے زیر اہتمام پٹنہ میں ۲۰ نومبر ۲۰۲۲ء کو منعقدہ یک روزہ سمینار میں ہوا تھا۔

جیسا کہ علمی دستور ہے، مرتب کتاب صفدر امام قادری نے یہاں تمام ضروری اور خاص تعارفی ومعلوماتی باتیں جدول وبہ جدول تحریر کر دی ہیں اور ممکنہ حد تک مشمولہ مواد کے جواز کا علمی وفکری پہلو ہی پڑھنے والوں کے سامنے نہیں رکھ دیا ہے بلکہ سمینار کے انعقاد اور کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ''بزم صدف'' کی دیرینہ پالیسی بھی اعادتاً واضح کر دی ہے، ساتھ ہی ساتھ کھلے لفظوں میں اس مجموعہ مضامین کو ظفر کمالی سے دیرینہ محبت کے اظہار کا ایک موقع بھی بتایا ہے اور پھر یہ لکھتے ہوئے کہ ''اس کتاب کی جو خوبیاں ہیں وہ ظفر کمالی اور تمام مقالہ نگاروں کی ہیں۔'' نہایت ہی علمی انکسار کے ساتھ اس دلی جذبے کا بھی اظہار کر دیا ہے کہ ''کاش! یہ کتاب اس سے اور بہتر ہو سکتی، مگر میری کوتاہیوں کی وجہ سے پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔'' میرے خیال میں مرتب کے قلم سے یہ محض لکھنے کی ایک بات ہے کہ ''ترتیب وتدوین کی متعدد خامیاں اس کتاب میں موجود ہیں۔'' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی ایک ایک سطر مرتب کی محنت ومحبت، ژرف نگاہی، صالح عقیدت مندی اور شعوری حقیقت پسندی کی گواہی دے رہی ہے۔

عرض مرتب کے بعد ''افتتاحیہ'' کے تحت اس کتاب میں

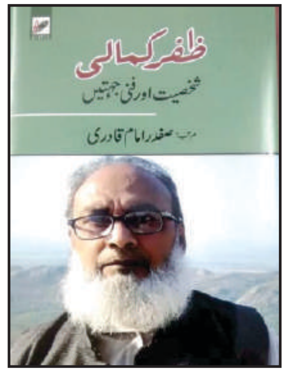

تین تحریریں ملتی ہے۔ پہلی تحریر عامر سبحانی کی تقریر کا متن ہے، جس میں انہوں نے نہایت ہی اخلاص، کشادہ دلی اور عظمت ذہنی کے ساتھ ظفر کمالی سے اپنے دیرینہ تعلقات کی یادیں تازہ کرتے ہوئے انہیں ساہتیہ اکادمی انعام پر مبارک باد دیا ہے۔ ان کی نظر میں ''ظفر کمالی کو ساہتیہ اکادمی انعام ملنا اُس انعام کو عزت بخشتا ہے۔'' یہاں دوسری تحریر صفدر امام قادری کی ہے۔ ان کے عنوانیہ الفاظ میں ''ظفر کمالی کو ساہتیہ اکادمی کا ادب اطفال کا انعام، گوشہ گیری کو انعام'' ہے اور جناب قادری کے لفظوں میں مزید یہ بھی کہ:

> ''کاش! ایمان اور انصاف کی بنیاد پر انعامات دینے کا چلن ہوتا تو ادب اطفال کے ساتھ ساتھ انہیں (ظفر کمالی کو) ساہتیہ اکادمی کا سینئر انعام بھی مل چکا ہوتا۔''

بعدازیں اس حصے کی تیسری اور آخری تحریر ''ساہتیہ اکادمی ادب اطفال انعامی تقریب میں ظفر کمالی کی تقریر'' کے متن پر مشتمل ہے جس میں اپنے بچپن کی یادوں کے دوش بدوش انہوں نے ادب اطفال کے باب میں یہ بھی کہا ہے کہ:

> ''بچوں کے لئے لکھنا سہل ممتنع میں شعر کہنا ہے ...... بچوں کی شاعری کا وصف یہ ہے کہ اس کی زبان عام فہم یعنی روزمرہ سے تعلق رکھتی ہو، اسلوب سادہ وشگفتہ ہو، بحر مترنم ہو اور آہنگ کا خیال رکھا گیا ہو اور جذبے کی صداقت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہو۔ ایک اور چیز جو کلیدی اہمیت کی حامل ہے وہ ہے شاعر کا بچوں کی نفسیات سے پوری طرح باخبر ہونا اور ان کی معصومیت اور بھولے پن کو اسی انداز سے محسوس کرنا...... ذاتی طور پر میں بچوں کے لئے جب بھی لکھتا ہوں تو میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ خود بھی بچہ بن جاؤں اور ان کی ذہنی سطح پر جا کر انہیں کے انداز میں سوچوں۔''

اس کتاب میں ''افتتاحیہ'' مشمولات کے بعد امتیاز وحید کے ''کلیدی خطبہ'' کو جگہ ملی ہے جس میں ''ظفر کمالی کا تخلیقی رجحان'' موضوع بیان قرار پایا ہے۔ یہاں بتایا گیا ہے کہ:

> ''ظفر کمالی کو رب کائنات نے قلب سلیم کی دولت سے نوازا ہے...... شعری بیان میں خودشناسی کی ظفر کمالی کی جملہ کوششیں انکساری اور خاکسارانہ طرز ادا میں لپٹی ہوئی ہیں...... ۱۹۸۰ء میں موصوف کی پہلی تخلیق 'شعلہ افکار' میں شائع ہوئی ...... (اور) نثر میں 'اور میں وزیر اعلیٰ بن گیا' ان کا پہلا مزاحیہ مضمون ہے جو 'مگدھ پنچ، پٹنہ بابت ۱۲/اپریل ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ...... احمد جمال پاشا کی تربیت نے کمالی صاحب کی ذہنی آبیاری کی...... اور ظرافت کی راہ پر گامزن کردیا۔ یہیں سے ظفر کمالی کی ادبی ترجیحات کا تعین ہوتا ہے...... ظفر کمالی کو حالی کی خاموش طبیعت کا رنگ بھاتا ہے...... وہ ایک وسیع المطالعہ (اور) ایک منظّم شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے کارناموں کا ایک بنیادی نکتہ تحقیق ہے اور تحقیق میں وہ قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی روایت کے امین ہیں...... (نیز) ادبی صحافت بھی ان کی ادبی اور علمی کارگزاریوں کا بنیادی حوالہ ہے...... (پھر) ظفر کمالی کے ادبی اور علمی کارناموں کا ایک روشن باب ان کی مقدمہ نویسی سے متعلق ہے۔ ......ظفر کمالی کے تخلیقی وفور کا ایک فعال شعبہ شعروسخنوری سے علاقہ رکھتا ہے...... ان کی افتادِ طبع میں اعلیٰ انسانی قدریں اور ظرافت دو نمایاں جہتیں ہیں ...... بچوں کے لئے ظفر کمالی نے ان موضوعات پر (اگرچہ) زیادہ نظمیں لکھی ہیں جو پرانے ہیں (مگر) اس نوع کی نظموں میں موضوع کی یکسانیت کے باوصف موضوع اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے انہوں نے اپنی جداگانہ انفرادیت قائم کی ہے ...... مجموعہ 'چہکاریں'

میں (رباعی کے) چوبیسوں اوزان کا استعمال کیا گیا ہے
جو ایک محتاط اندازے کے مطابق بچوں کے لئے کہی گئی
رباعی کے باب میں اپنی نوع کی پہلی کوشش ہے......ظفر
کمالی کی رباعیوں کی ایک شناخت ان کی شخصی رباعیوں
سے بھی قائم ہوتی ہے ......ظفر کمالی کے ادبی اور تخلیقی
کارناموں کا ایک نشان شہر آشوب کے زمرے میں آتا
ہے......دور حاضر میں جن ظرافت نگاروں کے دم سے
ظریفانہ ادب کا بھرم قائم ہے ان میں ظفر کمالی کا نام
سرفہرست ہے......ظریفانہ شاعری کے صیغے میں ظفر
کمالی نے بڑی تعداد میں قطعات (بھی) کہے ہیں۔''

زیر تبصرہ کتاب میں ظفر کمالی کی ''شخصیت'' پر گیارہ تحریریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔اس حصے کا آغاز ''آمد نامہ'' سے ہوا ہے جو اصلاً بقلم ظفر کمالی ان کے خودنوشت حالات ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی ایک ایک سطر بیان اور حسن بیان دونوں ہی لحاظ سے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، اسے ''عرض مرتب'' میں بجا طور پر ''بھرپور، کارآمد اور مستند معلومات کا خزینہ'' کہا گیا ہے۔''آمد نامہ'' کے بعد غضنفر کے قلم سے اس حصہ میں ''مرکزی افق پر حاشیائی شفق کی شعاعیں'' پھیلنے لگی ہیں اور ان کی تابانیاں ظفر کمالی کی شخصیت کے انعکاس میں پوری طرح کامیاب ہیں:

''بلاشبہ ظفر کمالی کمال کے آدمی ہیں اور یہ کمال انہیں ان
کے ذوق جمال نے بخشا ہے......ظفر کمالی کا ایک کمال
ان کی مہمان نوازی میں بھی نظر آتا ہے......(اور) دوستی
نبھانے میں بھی ظفر کمالی کو کمال حاصل ہے ......
(انہیں) ایک پلس پوائنٹ یہ بھی حاصل ہے کہ وہ نفس
مطمئنہ رکھتے ہیں۔''

یہاں ''میں تمہیں کیسے بھول جاؤں'' کے عنوان سے ظفر کمالی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے قطب الدین اشرف نے اپنی یادوں کا ایک جہاں سجا دیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ ''بلاشبہ تم ظفریاب ہو، کمالی ہو، میرے دوست ظفر کمالی'' خورشید احمد خاں نے ظفر کمالی کو ''صاحب کمال شخصیت'' قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''آپ بلا کے گوشہ نشین اور خلوت پسند واقع ہوئے
ہیں۔آپ ایک درد بھرا دل رکھتے ہیں......آپ کے اندر
ایک دھڑکتا ہوا دل اور ایک جاگتا ہوا ذہن ہے اور آپ
کا شعور بھی بہت پختہ ہے۔آپ کے اندر بلا کی گہرائی و
گیرائی ہے اور تنقیدی ادب میں تو لگتا ہے کہ پوری کی
پوری صحرانوردی آپ کے ہی حصہ کی چیز ہے......کمالی
صاحب کا دل محبت الٰہی اور محبت رسول سے لبریز ہے۔''

جاوید اقبال نے ''بھائی جان: ایک تاثر'' کے عنوان سے اگر ظفر کمالی کی نوع بہ نوع شخصی خوبیاں بیان کی ہیں اور ان کی شخصیت کو سرتاپا ''فیض بخش'' بتایا ہے تو نادر رضوی نے انہیں ایک ''مخلص انسان'' اور ''کثیر الجہات شخصیت'' کا حامل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ڈاکٹر ظفر کمالی کا مطالعہ کافی وسیع ہے......(اور) ان کی
شخصیت ہم اردو والوں کے لئے قابل تقلید بھی ہے اور
لائق اعتنا بھی۔''

امتیاز سرمد کے لفظوں میں:

''سادگی، بے نیازی اور لگن آپ کی زندگی کے اصل
رنگ ہیں جس میں آپ کی پوری زندگی رنگی ہوئی ہے
......آپ مسلکی تعصبات سے بیزار ہیں......(اور)
اہل علم کے قدرداں، ظفر کمالی سر کے حسن اخلاق، شفقت
اور علمی کاموں میں تعاون اور رہنمائی کی گواہی بھی
ضروری ہے۔آپ اخلاق کے دھنی ہیں......اس عہد میں
کسی کو اتنا خیال رکھنے والا استاد مل جائے تو اسے نعمت
غیر مترقبہ سمجھ کر اپنی قسمت پر ضرور نازاں ہونا چاہیئے۔''

تسلیم عارف نے ظفر کمالی کو ''درویش صفت ظرافت نگار'' کی حیثیت سے سامنے لایا ہے اور لکھا ہے کہ:

''وہ مختلف کتابوں کے مصنف ہیں لیکن مجھے وہ خود ایک
قابل مطالعہ کتاب نظر آتے ہیں۔وہ نہایت شریف الطبع
انسان ہیں ...... (اور) ان کی ایک امتیازی خصوصیت
ان کا یکسوئی سے کسی کام میں لگے رہنا ہے۔''

ظفر کمالی کے بارے میں اپنے ''ذاتی تاثرات'' قلم بند کرتے ہوئے انوارالحسن نے بتایا ہے کہ:

''ظفر کمالی کی تصوف سے گہری وابستگی ہے (اور) سنجیدہ ومتین ہونے کے ساتھ (وہ) خوش طبع، بذلہ سنج، حاضر جواب اور طبعی ظریف اور مہمان نواز بھی ہیں...... علم اور اہل علم سے محبت، پابندی وقت، بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت، شاگردوں کی پزیرائی، نام و نمود اور شہرت سے بے نیازی، صوم وصلواۃ کی پابندی، سادہ زندگی اور اونچی سوچ، یہ ایسے انسانی خصائل ہیں جن سے ظفر کمالی کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔''

شگفتہ ناز نے ڈاکٹر ظفر کمالی کی اردو سے بے پناہ اور اٹوٹ محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ:

''ظفر کمالی صاحب نے اپنی زندگی کے لئے کچھ اصول بنائے ہوئے ہیں جو انہیں ذہنی ستائش سے بچاتے ہیں...... سادگی کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت میں نرمی بھی پائی جاتی ہے۔''

اظہار خضر نے ظفر کمالی کی شخصیت اور خدمات کے تعلق سے اپنے خیالات پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ:

''اردو کے معاصر قلم کاروں کے درمیان ایک ممتاز و منفرد مقام ومرتبہ رکھتے ہیں۔''

اس کتاب میں ظفر کمالی کی ''تحقیق'' پر آٹھ مضامین سے قارئین کی ضیافت ہوئی ہے۔ یہاں یوسف ناظم نے ''متعلقات احمد جمال پاشا'' کو ''فاضل مصنف کی بے مثال تصنیف'' قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس میں انہوں نے:

''احمد جمال پاشا کی پوری زندگی کی تصویر' ان کی ولادت سے وفات تک کی جزئیات کے ساتھ سامنے لا دیا ہے۔ 'متعلقات احمد جمال پاشا' میں ایک لفظ بھی غیر متعلق نہیں۔ یہاں بے تکلفی کی ایک ایسی فضا انہوں نے اپنے زور قلم اور اسلوب سے پیش کردی ہے کہ قاری کھل کر سانس لیتا ہے اور خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔''

جب کہ ظفر کمالی کی اس کتاب کا اسلوبیاتی منظر نامہ دکھاتے ہوئے علی رفاد فتیحی نے لکھا ہے کہ یہ کتاب:

''اگرچہ احمد جمال پاشا کی ایک سچی کہانی بیان کرتی ہے، لیکن ساتھ ہی وہ ناول کی طرح ایک دلچسپ داستان سنانے پر بھی توجہ مرکوز کرتی ہے...... (اور) اساتذہ کو درپیش چیلنجوں کی عکاسی (بھی) کرتی ہے۔ یہ امید اور حوصلہ افزائی کا ایک طاقتور ذریعہ بن جاتی ہے اور اُن لوگوں کے حوصلے کو بڑھاتی ہے جو اپنے طلبہ کو بہت کچھ دینے کی سعی کرتے ہیں......اس کتاب میں' اکثر عکاسی اور خودشناسی کا لہجہ نظر آتا ہے......،متعلقات احمد جمال پاشا،جیسی یادداشتیں مصنف کے احساسات اور تجربات کو بیان کرنے کے لئے اکثر جذباتی اور وضاحتی زبان کا استعمال کرتی ہیں......اس یادداشت میں نہ صرف اس کے مرکزی کردار احمد جمال پاشا کو پیش کیا گیا ہے بلکہ ان لوگوں کو بھی شامل کیا گیا ہے، جنہوں نے ان کی زندگی میں اہم کردار ادا کئے تھے......یہ کتاب ایک ایسے استاد کی یادداشت ہے جو ایک ممتاز معلم کے ایک ایسے تجربات سے بھری ہوئی ہے جو ہندوستانی نظام تعلیم پر جگہ جگہ پر جوش تنقید کرتی ہے۔''

مرتب کتاب صفدر امام قادری نے اپنے طویل مضمون میں لکھا ہے کہ ''متعلقات احمد جمال پاشا'' تنقید وتحقیق کے میدان میں ''ظفر کمالی کا ابتدائی کام'' سہی، مگر اپنے مالہ اور ماعلیہ کے لحاظ سے یہ بہت ہی:

''سنجیدہ غیر معمولی اور اپنے موضوع پر بیش قیمت دستاویز ہے (اور) اس میں پیش کردہ مواد تحقیقی اعتبار سے صد فی صد مستند ہے۔''

ڈاکٹر ظفر کمالی کی کتاب ''تحقیقی تبصرے'' کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نے اسے مصنف کی ''معتبر ومستند تحقیق'' قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اس میں تبصرے کا عنصر کم اور تحقیقی ذوق زیادہ نمایاں ہے...... (یہاں) اپنے تبصروں میں (انہوں نے) جو تحقیق کے فن کو برتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔''

محمد ذاکر حسین نے ''تحقیقی تبصرے'' کے حوالے سے ظفر کمالی کو ''خارزار تحقیق کا شہسوار'' بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں انہوں نے بہت ہی:

''باریک بینی اور دوررسی سے محققوں کی تحقیقات کا جائزہ لیا ہے اور کسی مرحلے میں دامن انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔''

محمد ولی اللہ قادری نے ''تحقیقی تبصرے'' پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کتاب میں:

''ظفر کمالی نے اسلاف کی پیروی کرتے ہوئے تبصرہ نگاری کا مکمل حق ادا کر دیا ہے...... (اور) اس کے مطالعہ کا نچوڑ یہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب اردو تحقیق کے فنافی الشیخ محقق ظفر کمالی کا شاہکار ہے۔''

ظفر کمالی کے ''تحقیقی تبصرے'' کو ان کے ''تحقیقی مضامین کا مجموعہ'' بتاتے ہوئے افشاں بانو نے ''اندھیرے میں ایک علمی شمع'' کے مصداق قرار دیا ہے جب کہ اس حصے میں شامل اپنے دوسرے مقالہ میں مرتب کتاب صفدر امام قادری نے ''ظفر کمالی کی شان تحقیق'' کے اوصاف آئینہ کرتے ہوئے ''تحقیقی تبصرے'' کے تعلق سے لکھا ہے کہ اس کتاب کے مضامین میں ڈاکٹر ظفر کمالی نے:

''ایک ماہر محقق کے طور پر حقائق پر توجہ دی ہے اور انشاپردازی یا طول نگاری کے کسی بھی ڈھب کو یہاں آزمانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے......حقیقت میں یہ ایسے بنیادی مضامین کا مجموعہ ہے جس کے صفحات پر اصول تحقیق کی شاداب فصلیں لہلہارہی ہیں۔''

زیر نظر کتاب میں ظفر کمالی کی ''رباعی گوئی'' پر آٹھ مضامین کی شمولیت ہوئی ہے۔ یہاں قاسم فریدی نے ''رباعیات ظفر'' پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ موضوع کی سطح پر ان کی رباعیاں ''آج کی زندگی کی ترجمان'' اور ''عہد حاضر کا منظر نامہ ہیں'' اور ''مختلف موضوعات پر موثر اور دلچسپ رباعیاں کہنا ان کی قادرالکلامی کا ثبوت۔'' جہانگیر انس کے لفظوں میں:

''رباعی گوئی کے لئے جتنے لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے (وہ سب) ظفر کمالی میں بدرجہ اتم موجود ہیں...... اپنی رباعیوں کے لئے وہ ہر کیفیت، ہر خیال کے محدود منطقی پہلو سے وجدانی پہلو کشید کرتے ہیں اور اشاریت کے ذریعہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کی وضاحت کے لئے کئی صفحات کی ضرورت پیش آتی ہے......ان کی رباعیاں محض رسمی نہیں بلکہ فطری تقاضوں، تعمیری جذبات، پاکیزگیٔ خیال اور بلند تخیل سے مرکب ایک حسین پیکر ہیں...... (اور ان کی) بہت سی رباعیاں اپنے دور کی منظوم تاریخ بن گئی ہیں۔''

ظفر کمالی کی رباعیوں کے اس مجموعہ کی بابت نوشاد احمد کریمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس کے مطالعہ کے بعد بغیر کسی تامل کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دور جدید کے چند بڑے رباعی گوشعرا کی صف میں ظفر کمالی کا نام بھی نہایت ہی معتبر و محترم ہے۔''

یہاں ظفر امام، جناب ظفر کمالی کی رباعیاتی تصنیف ''خاک جستجو'' کے مطالعہ اور اس تعلق سے ''تمام جوازوں اور محاسبوں'' کے بعد وہ اس واضح نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

''ظفر کمالی کی تمام تحقیقی، تنقیدی اور شعری کارگزاریوں میں (ان کی) رباعیات کو ممتاز رکھا جانا چاہئے...... (بلاشبہ) داخلی اور خارجی ہر طرح کے تاثرات سے لبریز ان کی رباعیات اس صنف کو باوقار، مضبوط، پائیدار اور دلچسپ ہونے کا سامان فراہم کرتی ہیں۔''

نوشاد احمد کریمی نے ''رباعیات ظفر'' کے حوالے سے جہاں انہیں ''دور جدید کے چند بڑے رباعی گوشعرا کی صف'' میں ''معتبر ومحترم'' قرار دیا ہے، وہیں مرتب کتاب صفدر امام قادری نے ''ظفر کمالی کی رباعیاں'' کے عنوان سے لکھے گئے، اپنے وقیع اور مبسوط ومفصل مضمون میں نفس موضوع کا مختلف جہات سے نہایت کامیاب احاطہ کیا ہے اور دیگر متنوع نکات کی

نشاندہی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ظفر کمالی نے اپنی رباعیوں میں:

''شخصیت شناسی کا فریضہ ادا کیا ہے'......ان کی ظریفانہ رباعیاں حقیقتاً شہر آشوب ہیں......(اور عروضی اعتبار سے) انہوں نے رباعی کے تمام چوبیس اوزان اپنی کتاب میں استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ رباعی کا کلاسیکی شعور ان کے یہاں ہے اور عروضیوں کے امتحان میں وہ بصد خوشی اترنے اور کامیابی کا سودا پالنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔''

شگفتہ ناز نے ظفر کمالی کی شخصی رباعیوں پر نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''انہوں نے شخصیات کو رباعیات کے پیکر میں اتارتے ہوئے بہت سنجیدگی سے اور غور وفکر کے بعد اشخاص کا تذکرہ کیا ہے (اور اپنی شخصی رباعیوں میں) انسانی تفہیم کی ایک بے حد سنجیدہ اور نوکیلی کیفیت پیدا کی ہے۔''

ظفر کمالی کے مجموعہ رباعیات ''سوغات'' کو ڈاکٹر ظفر امام نے موضوع تحریر بناتے ہوئے جہاں اس کے محاسن بتائے ہیں اور یہ لکھا ہے کہ:

''ظفر کمالی نے علمی و ادبی سلسلہ کی رباعیوں کو دراز کیا ہے۔''

وہیں اس مجموعہ کو شخصی رباعیات میں ایک گرانقدر اضافہ قرار دیتے ہوئے محمد ذاکر حسین نے اسے صفدر امام قادری کے لئے موزوں ترین تحفہ بتایا ہے جس میں شاعر نے ''صفدرانہ مزاج سے واقفیت'' حاصل کر کے اپنے تاثرات کو الفاظ کے خلوت پنہا کر اور موتی کی لڑیوں میں پیش کیا ہے۔ یہ ''سوغات'' اب صرف صفدر صاحب تک محدود نہیں بلکہ اب ''ادب کا قیمتی سرمایہ'' بن گئی ہے۔

اس کتاب میں ظفر کمالی کی ''ظرافت'' کے حوالے سے گیارہ مضامین نے جگہ پائی ہے۔ یہاں سید شاہ ہلال احمد قادری نے اگر ''ضرب سخن'' کو ''ضرب کلیم سے کم نہیں'' قرار دیا ہے اور اسے ''کمالی کا کمال'' بتاتے ہوئے ان کی کتاب ''نمک دان'' کو مزاح کے معیار پر پوری اترنے والی کتاب کہا ہے تو اس میں یقیناً چنداں مبالغہ نہیں۔ اسی طرح ''ظرافت نامہ'' کا جائزہ لیتے ہوئے منظر اعجاز نے ظفر کمالی کو ''اکبر وواہی کی میراث کا جائز اور لائق وفائق وارث'' لکھا ہے تو اس سے بھی چنداں اختلاف مشکل ہے، اس لئے کہ منظر اعجاز ہی کے لفظوں میں:

''ظفر کمالی اپنی جدت وندرت اور انفرادیت سے نہ صرف اس روایت کا بھرم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں بلکہ اس میراث کو پایہ دار بھی بنایا ہے اور اس کے وزن و وقار میں اضافہ بھی کیا ہے۔''

مشتاق احمد نوری نے ''ظفر کمالی کا ظرافتی کمال'' دکھاتے ہوئے ان کے یہاں ''آج کے ادبی معاشرے کی اصلیت کی جم کر کھلی اڑانے'' کی بات کہی ہے اور لکھا ہے کہ:

''ظفر کے اشعار میں اگر ایک طرف طنز ومزاح کی چاشنی ہے تو بین السطور میں ایک حزن وملال کی بھی کیفیت ملتی ہے اور بین السطور کا یہی احساس ظفر کا اثاثہ ہے اور ان کی شاعری کا مغز بھی۔''

ریحان غنی کے مطالعہ کی رُو سے:

''ظفر کمالی کی ظریفانہ شاعری میں وہ سب کچھ ہے جسے ہمارا معاشرہ آج جھیل رہا ہے۔''

مرتب کتاب صفدر امام قادری نے ادبی موضوعات کے نباض کی حیثیت سے ظفر کمالی کو ایک دانشور ظریف بتاتے ہوئے اپنے طویل مضمون میں اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ:

''آنے والے وقت میں انہیں ظریفانہ ادب کے دانشور اور مفکر کی حیثیت سے لازمی طور پر پہچانا جائے گا۔''

جب کہ عطا عابدی کے لفظوں میں:

''ظفر کمالی کی ظرافت نگاری کا مکمل مطالعہ ان کو اردو ظرافت نگاری کی صنف کی امتیازی شخصیات کے شانہ بشانہ کھڑا کرتا ہے اور بعض جگہ یہ کچھ اور آگے (بھی) نظر آتے ہیں۔''

یہاں ظفر کمالی کے ''ظرافت نامہ'' پر تبصراتی نظر ڈالتے ہوئے ہمایون اشرف نے اگر یہ لکھا ہے کہ اس مجموعہ کی:

''کلاسیکی ہیئتوں میں لکھی گئی ('نہاری'، 'سلام'، 'عقد چہارم' اور 'عرب کی کمائی' جیسی) نظمیں پڑھنے والوں

کے ہونٹوں کو ہی نہیں اس کی سوچ کو بھی ہنسنے پر مجبور
کر دیتی ہیں۔''

تو عبدالوہاب قاسمی نے بتایا ہے کہ:

''ظفر کمالی کے یہاں بنیادی چیز ظرافت میں لطافت
اور تہداری ہے۔''

محمد عارف اقبال نے ظفر کمالی کی زندگی اور شخصیت کی طرف اجمالاً اشارہ کرتے ہوئے عرصۂ طنز وظرافت میں ان کے شاعرانہ کمالات کی بابت تحریر کیا ہے کہ:

''انہوں نے جس صورت حال، واردات اور واقعات کو
موضوع بنایا ہے اس کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ ایک
زندہ تصویر جسے نئی تکنیک کی زبان میں ویڈیو کلپ کہہ سکتے
ہیں، ہماری نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔''

جب کہ محمد شوکت علی کے بموجب:

''ظفر کمالی نے اپنی نظموں میں ظرافت کے ذریعہ کئی
(ایسے) حساس موضوعات پر بات کی ہے، جس پر واقعی
توجہ کی ضرورت ہے۔''

اور شاذیہ حسن کے خیال میں اُن کے یہاں عام طور سے نہ صرف یہ کہ ''سماجی نشتر زنی'' ملتی ہے بلکہ:

''ان کی ظرافت میں (ایسا) وقار اور (ایسی) سنجیدگی نظر
آتی ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر فلسفی اور مفکر معلوم ہوتے
ہیں (اور) کسی ظرافت نگار کی ادبی شخصیت کے لئے یہ
نقطۂ عروج ہے۔''

رباعیوں پر اظہار خیال کے بعد یہاں ''نظموں کے تجزیے'' اصلاً عملی تنقیدی کا بہت ہی اچھا نمونہ بن کر قاری کے سامنے آتے ہیں۔ یہ حصہ چار مضامین پر مشتمل ہے۔ ناہید پروین نے نظم ''ادھار کارڈ'' کو اختصار کے باوجود ''اپنی منطق کے انوکھے پن اور مستقبل پسند جہات کے سبب'' ظفر کمالی کی نمائندہ نظموں میں شمولیت کا حقدار بتایا ہے اور فرحت صغیر نے ان کی نظم ''خوشامد'' کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ''ظرافت کی دھیمی آنچ بین السطور سے روشنی اور گرمی بخشتی ہے۔'' جب کہ محمد شہزاد علی نے نظم ''تانیثیت کی حمایت میں'' کو ''اکبر اور واہی کے اسلوب بیان کی ایک کڑی'' قرار دیتے ہوئے اس خوبی کی بھی نشاندہی کی ہے کہ:

''یہاں تانیثیت کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے شاعر نے
'خود کو ایک فریق کے طور پر پیش کر کے نظم کے طنزیہ مفاہیم
سے پڑھنے والوں کو بے دخل کرنے کی غلطی نہیں کی ہے۔''

اس حصہ کا چوتھا اور آخری مضمون نظم ''عرب کی کمائی'' کے تجزیہ سے متعلق ہے، جس میں محمد عبدالرافع نے اس نظم کے ذہن ساز انتہاہی پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہاں شاعر نے ''موضوع سے متعلق تقریباً تمام ممکنہ باتوں کو احاطے میں لے لیا ہے۔''

پیش نظر کتاب میں ''ادب اطفال'' کے تحت تین مضامین ہیں۔ یہاں منی بھوشن کمار نے ظفر کمالی کی نظموں کا مبسوط موضوعاتی جائزہ لیا ہے اور ''چہکاریں'' کی رباعیوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس مجموعی نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ ''ظفر کمالی کا ادب اطفال حوصلہ بخش ہے۔'' جب کہ اس حصہ میں محمد مرجان علی نے ''حوصلوں کی اڑان'' کے حوالے سے اور نازیہ تبسم نے ''بچوں کا باغ'' کے حوالے سے نہایت ہی مبسوط گفتگو کی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ تینوں مضامین یہ تاثر دینے میں کامیاب ہیں کہ بچوں کے لئے ظفر کمالی کی ادبی خدمات بجائے خود بڑی اہمیت اور افادیت رکھتی ہیں۔

اس کتاب میں ''شعری تاثرات'' کا حصہ چھ شعرا کے سات کلام پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں جہاں افضل آٹکھمبوی نے ظفر کمالی کے تین شعری مجموعے ''ظرافت نامہ''، ''ڈنک'' اور ''رباعیاں'' پر اپنے تاثرات نظم کیا ہے اور زاہد سیوانی نے سات اور التفات امجدی نے پندرہ رباعیاں لکھی ہیں، وہیں امان ذخیروی نے ظفر کمالی کو ''بچوں کے شاعر'' کی حیثیت سے سامنے لایا ہے اور اُن پر ایک قطعہ بھی لکھا ہے، یہاں شکیل سہسرامی کی ظفر کمالی پر نظم اور گلفام صدیقی کا قطعہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کتاب کا یہ آخری حصہ اگر چہ کہنے کو محض شش ورقی ہے، مگر تحدید موضوع کے ساتھ یہ تین اصناف میں چھ شعرا کے تاثراتی کلام سے اپنے قاری کو نوازتا ہے اور بقول مرتب: ''پانچ سو سے زائد صفحات کی نثر کے مطالعہ کی تھکان'' دور کرنے میں واقعی کامیاب ہے۔

مختصر یہ کہ ''ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں'' جیسی مدونہ

کتاب سے شائقین ادب کو نوازنے کے لئے یقیناً صفدر امام قادری مبارکباد کے حقدار ہیں۔ اس سے پہلے بھی ''بزم صدف'' کے زیر اہتمام اُن کی ایک نہیں کئی نہایت وقیع علمی کتابیں پکی روشنائی میں آچکی ہیں۔ مزعومات پسندی، سہل پسندی اور شخصیت فراموشی کے ایک ایسے ماحول میں جہاں ہر طرف ''سکندر لوٹ کر بھی خوش نہیں دولت زمانے کی'' جیسا نفسیاتی منظرنامہ پھیلا ہوا ہے، وہاں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی ''قلندر مایہ 'علمی' لٹا کر رقص کرتا ہے'' تو یقیناً حیرت بھی ہوتی ہے، عبرت و بصیرت بھی ملتی ہے اور بہجت مسرت بھی، اتنا ہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ یہ یقین واثق بھی ہو جاتا ہے کہ اگر مخلصانہ علمی سخت کوشی اور شخصیت شناسی کے جذبے سلامت ہیں اور زیر تبصرہ کتاب کی شکل میں اپنے جلوے بکھیر رہے ہیں تو پھر نہ ہی اردو کا صدف موتیوں سے خالی ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کتاب کی اشاعت، پذیرائی سے تہی داماں۔ یہاں بنام تبصرہ ''ظفر کمالی: شخصیت اور فنی جہتیں''، پر قدرے تفصیل سے لکھنے کا مدعا بھی یہی ہے کہ ''پھر نہ کہنا مجھے خبر نہ ہوئی'' کا عذر جاتا رہے اور یہ مفید مطالعہ کاوش، حقیقت پسندی کا شعور رکھنے والے ہاتھوں تک بھی پہنچے اور عوامی و نجی کتب خانوں میں بھی محفوظ ہو سکے۔ خدا کرے یہ مدعا، دعائے مبرور بن جائے۔ آمین!

نام کتاب	:	پھول ببولوں کے		
مصنف	:	آثر فریدی		
ناشر	:	ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ		
اشاعت	:	۲۰۲۳ء		
صفحات	:	۱۱۲	قیمت :	۳۰۰ روپے
مبصر	:	**ڈاکٹر آصف سلیم**		

آثر فریدی کا شمار کے اعتبار سے دوسرا شعری مجموعہ بنام ''پھول ببولوں کے'' منظر عام پر آیا ہے۔ آثر عرصہ دراز سے شاعری کر رہے ہیں۔ وہ رسائل میں اپنے کلام کی اشاعت کے توسط سے جہاں دکھائی دیتے ہیں، وہیں مشاعروں میں بھی تواتر کے ساتھ اپنی موجودگی درج کراتے رہتے ہیں۔ فقیرانہ شان کا ان کے یہاں یہ عالم ہے کہ محدود

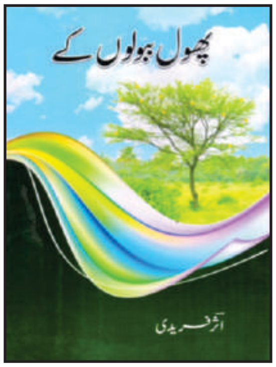

آمدنی کے وسائل کے باوجود اُن کے چہرے پر سدا بشاشت کے رنگوں کا غلبہ رہا۔ وہ شخصی اعتبار سے کسی قسم کی تفریق من و تو کے کبھی حامی نہ رہے اور عین کشادہ قلبی کے ساتھ شعارِ انسانیت کے پاس و لحاظ کی رو سے ہر کسی کے مابین راہ و ربط کا ہمہ دم عمومی اہتمام کیا۔ یہی سبب ہے کہ متذکرہ شاعر کی مجموعی شعری کیفیات بطورِ خاص دوسمت کے اقوال سے ہماری آشنائی کا سامان کرتی دکھائی دیتی ہیں جن میں ایک جانب بنام ماضی گزرے ہوئے زمانے کی حق و صداقت پر مبنی تہذیبی و اخلاقی قدروں کی باتیں ہیں، جب کہ دوم کا قصہ یہ ہے کہ وہاں ان کے گرد و پیش کے سماجی معاملات و مسائل کے راست اظہار کی سہل طرز کاوشیں ہیں جو عصری جہاں سے ہماری وابستگی کی بلاواسطہ سبیل بن جاتی ہیں۔

نام کتاب یعنی ''پھول ببولوں کے''، پہ غور کریں تو فکر و خیال کی سطح پر شاعر کی وسعت نظر کے بہرحال ہم قائل ہو جاتے ہیں کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ یہاں ظاہر و باطن کے زینے ہی زینے ہیں جنہیں سر کرنے کے عمل میں فن کار کا تلاش و دریافت کا رویہ کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ نہایت شکر کا مقام ہے کہ آثر فریدی اس حوالے سے ہر زینہ نہایت ہی سنجیدہ اور محتاط رہے ہیں۔

آثر فریدی کی ایک سو بارہ صفحات کی اس کتاب کا سرورق بامعنی بھی ہے اور دیدہ زیب بھی ہے جو میری نظر میں ان کی شعریات کے واسطے سے گہری نسبت رکھتا ہے اور آمادۂ مطالعہ کرتا ہے۔

اس کتاب کے مشمولات کی فہرست میں ''حرفِ آغاز'' کے تحت شاعر کے تمہیدی کلمات ہیں جہاں انہوں نے ماقبل کے اشاعت پذیر شعری مجموعہ کے ساتھ تازہ شعری مجموعہ سے قاری کو باخبر کرتے ہوئے عظیم آباد کے ساتھ اپنے آبائی وطن سہسرام کے مخلصین کے ہم راہ مرحوم و باحیات بھائیوں کے اذکار کو ایک صحتمند شعری مثال کے توسط سے تمام کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔

ہم بھائیوں میں کوئی بھی تکرار نہیں ہے
آنگن میں ہمارے کوئی دیوار نہیں ہے

اس کے بعد آثر فریدی کی شاعری کی مختلف جہتوں کو اُجاگر کرنے کے ذیل میں اردو ادب کی معروف شخصیتوں کے تقریباً اختصار کے ساتھ تحریر کردہ مضامین کی شمولیت ہے۔ یہاں شفیع مشہدی، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر اعجاز علی ارشد، منور رانا اور ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی جیسے لوگوں کا اس طور پر عمومی اتفاق ہے کہ ان کی شخصیت کی سادگی اور اخلاق مندی کے طرز پر ان کی شاعری کا بنیادی حسن بھی سادگی ہے۔ وہ دل کی بات دل کی زبان میں پیش کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں، چنانچہ زندگی کی حقیقتوں کو نہایت مؤثر انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ وہ قلندری کی صفت سے معمور ہیں اور سہل ممتنع میں شعر کہنا ان کا فنی شعار ہے۔

شاعر کے متذکرہ مجموعہ کلام میں حمد باری تعالیٰ اور نعت مقدس سے گزرنے کے بعد ان کی غزلیات کے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے جو ۳۷ کی تعداد میں ہیں۔ آثر کی غزلوں سے وابستگی کے عالم میں اشعار کے واسطے سے رنگ رنگ کے ڈھیروں موضوعات ہماری فہم کا حصہ بن جاتے ہیں، مثلاً گزرے ہوئے ایام کے ساتھ پرکھوں کی باتیں، مقدر بدلنے کی خاطر ہمت وحوصلے کے بوتے آگے بڑھنے کی ترغیب، دنیائے فانی میں نفرت مٹانے اور دل بجھانے کی نصیحت، بسی بسائی بستی اجاڑ دینے والوں کے منافرت کے اقدام، دل سے دل کو دور کر دینے والا غیر انسانی فعل وعمل، اپنی اَنا کے ساتھ ہزار دُکھ لئے جینے کی سلیقہ مندی، مذہبی فرقوں کے سبب بربادی کے اطوار، طبقاتی تفریق کے عوامل، انسانی محرومیوں کے احوال، سیاسی مفادات، لاک ڈاؤن کے حالات اور عشق محبت کے لطیف احساسات وغیرہ کے ساتھ اس اہم نکتہ پر قصہ گویا تمام ہوتا ہے کہ دراصل فقیری میں ہی امیری کے نشے کا راز پنہاں ہے۔ گئے دنوں کی محبت واخوت کے جذبوں سے مسلسل دور ہوتی ہوئی مکر وفریب سے دوچار امروز کی دنیا کے تعلق سے شاعر نے ایک مؤثر شعر خلق کیا ہے۔

پھولوں کے دن بیت گئے ہیں موسم ہیں ترشولوں کے
دیکھ رہے ہیں قدم قدم پہ کھلتے پھول ببولوں کے

واقعی پھولوں کے دن کا گزر جانا، موسم میں ترشولوں کا در آنا اور ببولوں کا فروغ پا جانا کسی حساس فنکار کے لئے سوہانِ روح نہیں تو اور کیا ہے۔ معنوی اعتبار سے ایک اہم شعر یہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہمیں سے خفا ہیں تری دنیا والے
ہمیں تیری دنیا سنبھالے ہوئے ہیں

اس طرح بطور مجموعی مجھے یہ کہنے میں عذر نہیں کہ آثر فریدی نے سادگی بھرے طرزِ اظہار کو بروئے کار لا کر اپنے مشاہدات پہ مبنی مختلف موضوعات کو پیراہن شعری عطا کرنے کے عمل میں اپنی بساط بھر کامیاب سعی کی ہے۔

نام کتاب	:	وہ جو کہنا امر محال تھا		
مصنف	:	م۔اشرف		
ناشر	:	ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ		
صفحات	:	۱۳۶	قیمت :	۲۵۰ روپے
مبصرہ	:	**ڈاکٹر بدر محمدی**		

اردو غزل سے ہر شاعر حقیقتاً وہ محبت کرتا ہے جو کسی خیالی محبوب سے کرتا ہے۔ یہ وہ دوشیزہ ہے جو نہایت خوبصورت ہے، مگر اس کی آرائش وزیبائش کر کے اسے مزید خوبصورت بنانے کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہے۔ آزاد غزل اور دوہا غزل کے سلسلے میں کیا گیا تجربہ مختلف صورتوں میں ہیئتی اور فکری سطح پر متعدد شعرا کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تغیرات کے عمل نے غزل کی مقبولیت کو استحکام بخشا ہے۔ اردو غزل کو تغیرات سے دوچار کرنے والوں میں م۔اشرف کا نام آج کی تاریخ میں منفرد حیثیت کا حامل ہے، جنہوں نے غزل کی شاعری کی ہے، مگر یہ شاعری کثیر القوافی کی شاعری ہے۔ یعنی دو سے زیادہ قوافی کی شاعری اور یہ شاعری م۔اشرف نے اس قدر کی ہے کہ ''وہ جو کہنا امر محال تھا'' کے نام سے ان کی کثیر القوافی غزلوں کا زیر نظر مجموعہ بھی منظر عام پر آ گیا ہے۔ یہ شعری گلدستہ بقول شاعر ادب کی دنیا کا واحد کثیر القوافی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ م۔اشرف کے اس کارنامے کا اعتراف پروفیسر وہاب اشرفی، ڈاکٹر کلیم عاجز، ناوک حمزہ پوری، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر علیم اللہ حالی، شفیع مشہدی، مشتاق احمد نوری، قوس صدیقی، منیر سیفی نے کیا ہے۔ خود م۔اشرف نے اپنی کارکردگی کا ذکر یوں کیا ہے۔

نئی فصلیں، نیا خوشہ، نیا دہقاں غضب کا ہے
سبھی دیکھو یہ آئینہ نیا میداں ادب کا ہے

بزم سخن بھی اشرؔف حیرت سے دیکھتی ہے
آئی یہ کیسی ندرت تیرے شعار تک بھی

کلام اس کثیرالقوافی میں اشرؔف
کہے کس نے تیری ذہانت سے پہلے

ردا سہ قافیہ کی اوڑھ کر نکلی غزل اشرؔف
زمانہ مان لے گا جب ڈگر تیری جدا ہوگی

کاٹے ہے خوب میم قوافی کی فصل کو
جوتے بھی وہ دھرتی کو جدت کی ہل سے ہے

''وہ جو کہنا امر محال تھا'' میں غزل کے علاوہ حمد اور نعت بھی ہیں۔ یہ حمد و نعت آغاز کتاب میں ہی نہیں درمیانی حصے میں بھی ہیں۔ یعنی ایک قبیل کی چیزیں ایک جگہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ م۔اشرؔف نے اپنی تخلیقات کو ترتیب دینے میں قوافی کے گھٹتے سلسلہ کو بنیاد بنایا ہے، چنانچہ پہلے بارہ قوافی کی چیز کو جگہ دی گئی ہے۔ پھر گیارہ، دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار اور اخیر میں سہ قوافی کلام کو شامل کیا گیا ہے۔

م۔اشرؔف نے ترتیب مشتملات میں بھی نیا تجربہ کیا ہے۔ م۔اشرؔف کا یہ حسن عمل بھی لائق تحسین ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ قوافی کا استعمال حمد میں کیا ہے اور اس کے بعد نعت میں۔ م۔اشرؔف نے کثیرالقوافی کی بازی گری ایک صفت کے طور پر کی ہے اور مسلسل کی ہے۔

ظاہر ہے کہ شروع میں انہوں نے روایتی کلام کہے ہوں گے، مگر ان میں سے کسی کو م۔اشرف نے اپنے مجموعے میں شامل نہیں کیا ہے۔

م۔اشرؔف نے کثیرالقوافی کی روش پروفیسر وہاب اشرفی کی ایما پر اختیار کی، جیسا کہ انہوں نے ''حرف آغاز'' میں تحریر کیا ہے، جب کہ ان کے استاد سخن رہے ہیں قوؔس صدیقی اور طلحہ رضوی برؔق۔ ان اساتذہ نے م۔اشرؔف کو کثیرالقوافی کے گر نہیں بتائے، وہ اس لئے کہ اس طرز شاعری کے موجد خود م۔اشرؔف ہیں اور اس کے اصول بھی انہوں نے ہی مرتب کئے ہیں، لیکن عام شاعری کے جو رموز و نکات ہیں ان سے واقفیت اساتذہ نے حاصل کرائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ م۔اشرؔف کی غزلوں میں کثیرالقوافی کی پابندی کے باوجود ان کے اشعار دولخت یا

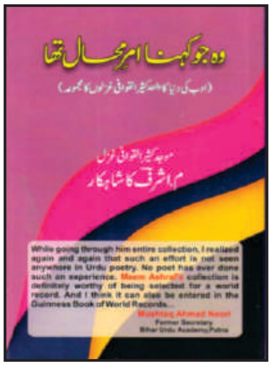

بے ربط نہیں۔ ان میں جاذبیت اور دلکشی ہے، احساسات و تجربات کی پاسداری ہے۔ موزونیت اور شعریت اس طرح موجود ہے جیسے کسی خوش فکر شاعر کے پاس مترنم آواز بھی ہو۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

وفا کی نظم ہے کتنی مچلتی آنکھ میں دیکھو
غزالی شرم ہے اب بھی غزالی آنکھ میں دیکھو

چہرے کئی سپید لگے ہیں بہار میں
بادل سبھی جو قید ہوئے زلف یار میں

جب کبھی دن مرے نصیب کے سنورتے ہیں
آپ دل کھول کے قریب سے گزرتے ہیں

یہی تو ہوش مندی کتنے کو بے ہوش رکھتی ہے
ہے جتنی خوبصورت چیز وہ خاموش رہتی ہے

کاش کوئی دائرہ اٹھے دل بیتاب میں
چاند تارے بھی نہا لیتے ہیں ٹھہرے آب میں

تاکہ ہو ان کی شہرت میرے مزار تک بھی
آئی ہے ان کی میت میرے دیار تک بھی

محولہ بالا اشعار میں غزل کا روایتی رنگ و آہنگ ہے، حسن کی چاہت، عشق کی لذت کا ذکر ہے، نظر کی آسودگی اور دل کی بیتابی کی روداد ہے۔ ان اشعار میں ایسی سلاست و روانی ہے کہ کہیں ناہمواریت محسوس نہیں ہوتی۔ غور کرنے پر ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ کثیرالقوافی کی شاعری ہے۔

غرض کہ م۔اشرفؔ نے کثیر القوافی کی شاعری تو کی ہے،مگر اس ادھیڑ بن میں خیال اور موضوع کو متزلزل نہیں کیا ہے، احساس کی ترجمانی کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ انہوں نے گرد و پیش پر نگاہ رکھی ہے، اپنے مشاہدے سے تجربہ حاصل کیا ہے اور ان تجربات ومشاہدات کو پیکر شعر میں ڈھالا ہے۔نئی روش کی شاعری میں قدیم زمانے کی بات نہیں بلکہ حال کا منظر نامہ پیش کیا ہے ۔

چہار سو آباد ہیں اب ظلم کی ہی بستیاں
طالبان حق کا تو کوئی نگر باقی نہیں

یونہی بڑھتا رہے گا بے حجابی کا چلن تو پھر
نہیں اک آنکھ میں بھی نام بھر باقی حیا ہوگی

وہ ہے مجبور اشرفؔ دیکھنے کو
جو سارا ماجرا دیکھا نہ جائے

کثیر القوافی کی شاعری یقیناً امر محال ہے۔م۔اشرفؔ نے محنت ومشقت اور مشق وریاضت سے کام لیا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ مطلع میں زیادہ مشقت کرنی پڑی ہے اور پھر شعر کے مصرع ثانی میں۔شاعر نے سخت روی کو اپنی فطرت بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔وہ عملاً فعال ومتحرک ہے اور اس نے حرکت وحرارت کی ترغیب بھی دی ہے۔اپنی غزلوں میں م۔اشرفؔ نے جوش وولولہ اور ہمت وحوصلہ بڑھانے میں محویت دکھائی ہے۔ان کے اشعار پیغام عمل سے لبریز ہیں۔م۔اشرفؔ نے رواں دواں رہنے اور تگ ودو سے استفادہ کا درس دیا ہے۔تن آسانی سے گریز کا سبق پڑھایا ہے۔بے بسی اور بے حسی کے حصار سے نکلنے اور میدان کارزار میں قدم رکھنے کی دعوت دی ہے۔تازہ کار شاعر م۔اشرفؔ نے اپنی کثیر القوافی غزلوں سے قاری کو تازہ دم کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے ۔

کار گاہ زندگی میں وسعتیں پائی گئیں
کارگر ہوتی رہی ہے جب بھی محنت دھوپ میں

آج بھی مزدور کی محنت ہے پانی کی طرح
تر پسینے سے ہوا جیسے نہائے آب میں

بہت امید ہے بدلے گا اب منظر یہاں اشرفؔ
سوالی عزم ہے جلتی سلگتی آنکھ میں دیکھو

یہی مغلوب کر دے گی ترے اغیار کو تجھ سے
وہ تجھ میں قوت تسخیر جو کم کوش رہتی ہے

تحفظ کو اس کے ہمیشہ ہے خطرہ
کھڑا رہ گیا جو سنبھالے سپر کو

م۔اشرفؔ کا اصل نام محبوب اشرف ہے مگر مقطع میں کہیں میم اور کہیں اشرف کا تخلص استعمال کیا ہے۔

محبوب اشرف کی شاعری غزل کی شاعری ہے، اس لئے کثیر القوافی کا اندازہ مطلع میں ہی ہوتا ہے دیگر شعروں میں نہیں۔یہ بھی حقیقت ہے کہ کثیر القوافی میں زیادہ قوافی سے فصیح کم قوافی کی غزلیں ہیں۔

م۔اشرفؔ کی قافیہ پیمائی بلاشبہ اوروں سے جداگانہ ہے۔ انہوں نے قوافی کی فصل اگائی ہے اور ردیف سے اس کی آبیاری کی ہے۔مطلب یہ کہ م۔اشرفؔ کی کثیر القوافی شاعری میں ردیف وقافیہ دونوں کے برتنے میں ہنرمندی سے کام لیا گیا ہے۔

م۔اشرفؔ کی زیادہ تر زمینیں اپنی اختراع کی ہوئی ہیں،مگر بعض طرحی کلام میں بھی انہوں نے کثیر القوافی کی پابندی کی ہے۔ م۔اشرفؔ کی کاوش آزاد غزل، دوہا غزل، حالیہ، ہائیکو، ماہیہ سے علاحدہ نوعیت کی ہے۔انہوں نے اپنے استاد سخن قوسؔ صدیقی کی نئی تشکیلات کی روش بھی نہیں اختیار کی ہے، مگر بعض مقام پر قوساب، دل قاب، چشماب جیسی تراکیب بھی استعمال کی ہیں۔''وہ جو کہنا امر محال تھا'' کی شاعری یقیناً امر محال ہے۔م۔اشرفؔ نے جو کار محال انجام دیا ہے۔اس سلسلے میں وحشتؔ کلکتوی کا یہ شعر ان پر صدفی صد صادق آتا ہے ۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

کثیر القوافی کی شاعری میں م۔اشرفؔ نے کسی کی پیروی نہیں کی ہے اور یہ بھی درست ہے کہ م۔اشرفؔ کی اس روش کی بھی کسی نے پیروی نہیں کی ہے،لہٰذا اس روزگار میں وہ یکتا ہیں۔آج کی تاریخ میں ان کا کوئی

ثانی نہیں اور جب کوئی ثانی نہیں تو اس طرح کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیوں کر ممکن ہو، چنانچہ م۔اشرؔف کے ادبی مقام کا تعین کار سہل نہیں۔ کثیر القوافی کی شاعری کرنا ہی ان کے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے۔خوبی اور خامی اپنی جگہ، مگر کثیر القوافی کی ایجاد عظیم کارنامہ ہے۔م۔اشرؔف نے مشکل بحر کو منھ نہیں لگایا ہے۔آسان بحروں میں ہی کثیر القوافی کی ہنرمندی دکھائی ہے، ورنہ دوہری پریشانی ہوجاتی۔م۔اشرؔف کی شاعری پوری کی پوری شعوری شاعری ہے۔آورد کی شاعری ہے، مگر اس میں آمد کا رنگ و آہنگ ہے۔آورد میں آمد کی کیفیت پیدا کرنا م۔اشرؔف کا شاعرانہ کمال ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ ''وہ جو کہنا امر محال تھا'' اپنی نوعیت کا واحد مجموعہ نہ ہوکر نقش اوّل ثابت ہوگا اور م۔اشرؔف اس کا نقش دوم بھی لانے میں کامیاب رہیں گے۔ان کا یہ عمل انہیں انفرادو امتیاز کی سند عطا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔

نام کتاب	:	وقائع اخیار		
مؤلف	:	حضرت مولانا الحاج شمس الہدیٰ		
جمع وترتیب	:	محمد صباح الوریٰ (رافع)		
اشاعت	:	۲۰۲۳ء		
صفحات	:	۴۸۰	قیمت :	۳۰۰روپے
مبصر	:	**زبیر احمد بھاگلپوری**		

گزشتہ بیسویں صدی میں یہاں حضرت مولانا محمد علی مونگیری، حضرت مولانا بشارت کریم اور حضرت شاہ نعمت اللہ کی تین ایسی عظیم روحانی شخصیتیں ہوئیں، جنھوں نے متحدہ بہار کے لاکھوں متلاشیان حق کے تاریک دلوں کو لعل شب چراغ کے مانند منور کیا۔ سلسلہ نقشبندیہ سے منسلک متذکرہ تینوں اکابر راہ سلوک کے خلفا و نائبین کا بافیض سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

حضرت مولانا بشارت کریم رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کے بطور شیخ طریقت قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین حضرت مولانا الحاج شمس الہدیٰ صاحب نقشبندی دامت برکاتہ کی ذات گرامی ہنوز باحیات ہے اور اپنی بافیض شخصیت سے خصوصاً شمالی بہار کے ہزاروں تشنگان رشد وہدایت کو سیراب کر رہی ہے۔شیخ کے بیش قیمت ارشادات، ملفوظات اور مکتوبات سالکین حق کی ہدایات کا مضبوط وسیلہ رہے ہیں، لیکن رموز تصوف اور اسرار حقیقت پر مشتمل ان بیش بہا رخزینہ رشد وہدایت کا کتابی شکل میں زیور طباعت سے آراستہ کرنا فطری طور پر اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ ان شیوخ کو ذاتی معمولات اور مریدین کی اصلاح ظاہر و باطن کے عمل سے فرصت ہی بہت کم ہوتی ہے۔حضرت مولانا شمس الہدیٰ صاحب نقشبندی کا انفراد یہ ہے کہ روحانیت اور تصوف پر مبنی ان کی چار چار تالیفات ان کی زندگی میں ہی شائع ہوکر راہ حق کے مسافرین کی نہ صرف رہنمائی کر رہی ہیں، بلکہ منزل تک رسائی کے لئے ان کے جذبہ حق پرست کو مہمیز بھی کر رہی ہیں۔

حضرت والا کی تازہ ترین تالیف بعنوان ''وقائع اخیار'' اسی سال شائع ہوکر سالکین ومریدین کے درد دل کی چارہ گری کر رہی ہے۔اس سے قبل ''الاکلیل''، ''سیر الصالحین'' اور ''اوراد ووظائف'' کے عنوان سے ان کی تین اہم تالیفات شائع ہوکر دنیائے تصوف میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔

زیر نظر کتاب ''وقائع اخیار'' آٹھ یا نو حصوں پر مشتمل ہے اور عناوین کے تنوع کے باوجود اس تالیف کی قدر مشترک یہ ہے کہ اس کا ہر حصہ کسی نہ کسی نہج سے روحانیت اور تصوف کے گہرے رموز سے ہی وابستہ ہے۔یوں تو تصوف کے حوالے سے بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں، لیکن اس کتاب کا اختصاص یہ ہے کہ اس کا ہر حصہ علمی اور روحانی اعتبار سے انتہائی وقیع ہے اور اسرار تصوف سے متعلق اصطلاحات کی سہل اور سلیس توضیح اور ان کی موزوں عقدہ کشائی اسے متلاشیان حق کے درمیان انتہائی اہم بنا دیتی ہے۔

کتاب کا بیشتر حصہ پیر طریقت مولانا شمس الہدیٰ صاحب کی سرگزشت پر مبنی ہے، جس کی ترتیب یوں تو محمد صباح الوریٰ (رافع) صاحب کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے، لیکن کچھ حصے شیخ طریقت حضرت مولانا محمد شمس الہدیٰ صاحب کے دیگر متعلقین کے بھی شامل اشاعت ہیں۔مثلاً اس کا دوسرا حصہ جو ''کاروان اہل دل'' کے عنوان سے شامل ہے، دراصل

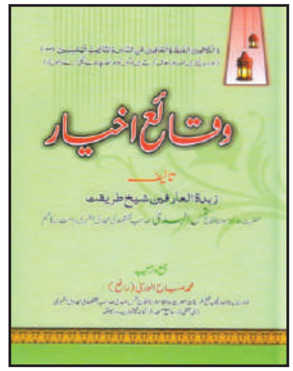

شیخ کے سفر دہلی اور مولانا ابوالنصر فاروقی صاحب کے سفر بہار کی تفصیلی روداد ہے جسے وصی احمد شمسی صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ یہ دونوں اسفار روح پرور ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات افزا بھی ہیں۔

اس میں موصوف مرتب نے مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے حوالے سے خصوصاً اہل بہار کے لئے یہ معلومات فراہم کی ہے کہ حضرت خواجہ محمد معصوم کے مشورے سے اورنگ زیب عالمگیر نے ان کے ایک خلیفہ کو شہر پٹنہ کے طالبان سلوک کی تربیت کے لئے بھیجا تھا جن کی قبر آج بھی پٹنہ صاحب واقع اورنگ زیب کی تعمیر کردہ مسجد ''شاہی مسجد'' کے صحن میں موجود ہے جس پر نام بھی کندہ ہے، لیکن مرور ایام کے سبب اس پر پڑنے والی دھول اور ہوا نے اسے ناقابل قرأت بنادیا۔ خود مجدد الف ثانی نے اپنے خلیفہ شیخ نورمحمد پٹی کو دعوت وارشاد کے لئے پٹنہ بھیجا تھا جن کے نام پر آج بھی محلّہ ''نور گنج'' موجود ہے۔ ساتھ ہی وہاں کے قبرستان میں آج بھی آپ کا مزار موجود ہے، جس پر آپ کا اسم گرامی تو ہے، لیکن پڑھنے کے قابل نہیں۔ ان کے علاوہ مجدد الف ثانی نے خواجہ شیخ عبدالحیٔ حصاری کو بھی بغرض رشد وہدایت پٹنہ بھیجا۔ ان کے علاوہ بھی کئی بزرگوں کو حضرت خواجہ محمد معصوم نے بہار کی جانب بھیجا جن کی تفصیلات کتاب ھذا میں بحوالہ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' موجود ہے۔

کتاب کا ایک انتہائی اہم حصہ وہ ہے جو ''کلمات طیبات'' کے عنوان سے حضرت مولانا ابوالنصر انس فاروقی صاحب دہلی کے ذریعہ بصورت تقریظ اس میں شامل ہے، جس میں حضرت مولانا نے تصوف کے تاریخی پس منظر پر اجمالی روشنی ڈالتے ہوئے سلسلۂ کلام کو سرزمین بہار کے صوفیائے کرام تک ایصال کی سعی کی ہے۔ ساتھ ہی ان بہاری اکابر تصوف کے خانقاہ مظہریہ خیریہ، دہلی سے روابط وروحانی انسلاکات کا ذکر انتہائی دلچسپ اور سلیس انداز میں کیا ہے۔ حقیقتاً حضرت کے کلمات طیبات نے کتاب کی معنویت میں متعدبہ اضافہ کردیا ہے۔ اخیر میں انہوں نے کتاب کی غرض تالیف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اصل مقصد اس میں آپ کی بقیہ تحریرات اور یادداشت کو شائع کرنا ہے جو پہلے کی دو کتب 'الاکلیل' اور 'سیر الصالحین' میں شائع ہونے سے رہ گئی تھیں۔ مزید اس میں مولانا بشیر احمد موہانی کا کلام بھی شائع کیا ہے جس کا ذمہ آپ نے خود لیا تھا کہ اس کو طبع کرائیں گے۔''

آخری حصے میں مولانا معین الدین قاسمی صاحب اور محمد مرغوب الرحمٰن ندوی صاحب کے دو مختصر، مگر جامع مقالات ''سیر الصالحین'' کے تعارف اور شیخ طریقت حضرت مولانا شمس الہدیٰ صاحب مدظلۂ العالی کے یومیہ معمولات زندگی کی تفہیم پر مشتمل ہیں، جنہیں شیخ طریقت کی ذات گرامی کا ''شناخت نامہ'' قرار دیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ کتاب کی حقیقی شان نزول حضرت مولانا احمد بشیر موہانی رحمتہ اللہ علیہ کے عشق رسول سے سرشار وہ چند اشعار ہیں جو شامل اشاعت ہیں۔ ان کے ایک قطعہ سے سلسلۂ تبصرہ منقطع کرتا ہوں ۔

تیرے دیار میں پہنچے تو صدا بھول گئے
مدعا یاد نہیں حرف دعا بھول گئے
جب پڑی گنبد خضریٰ پہ نظر یا اللہ
رحمت کل کی عطا ، جودوسخا بھول گئے

نام کتاب	:	مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ		
مصنف	:	پروفیسر عبدالبرکات		
ناشر	:	اپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی		
اشاعت	:	۲۰۲۲ء		
صفحات	:	۱۵۲	قیمت :	۳۰۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر محمد وسیم رضا		

اردو ادب کی تاریخ میں ''دکنیات'' کا مرتبہ مسلم ہے اور یہی وجہ ہے کہ تحقیق وتنقید کے رُخ سے اس عظیم وقدیم ادبی ولسانی سرمائے اور اس کے ذیل میں آنے والے ایک ایک فنی شہ پارے پر اکابرین

نقد وادب نے ایک سے بڑھ کر ایک کتابیں لکھی ہیں اور نقد دکنیات کی روایت وقت کے ساتھ ساتھ مزید استوار ہوتی رہی ہے۔ دکنی شعر وادب کا مطالعہ چونکہ درسیات کا ایک اہم موضوع اور لازمی حصہ بھی ہے، اس لئے ہمیشہ ہی ہمارے ارباب نظر کی یہ متواتر کاوش رہی ہے کہ اس کی تدریس میں طلبا و طالبات کو آسانیاں ملتی رہیں اور اساتذہ کی محنتیں بھی نسبتاً کم وقتوں میں زیادہ بارآور ہوں۔

درحقیقت تدریسی تنقید کی اپنی ضرورت واہمیت اور افادیت ہے اور اس لحاظ سے دکن کے مشہور، داخل نصاب شہ پاروں پر لکھی گئی کتابیں ہمیں خصوصاً متوجہ کر لیتی ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال پروفیسر عبدالبرکات کی تصنیف ''مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ'' ہے۔ پروفیسر موصوف کی یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۸۶ء میں چھپی تھی اور اب اس کی دوسری اشاعت منظر پر آئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف نے اسے کسی اشاعتی مالی اعانت کے بغیر اپنی جیب خاص سے شائع کیا ہے۔

پروفیسر عبدالبرکات کا مطالعہ وسیع ہے۔ زمانۂ طالب علمی سے ان کے مضامین ملک و بیرونِ ملک کے مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں جس پر مستند اربابِ قلم کی آرا بھی مطالعے میں آتی رہتی ہیں۔ زیر نظر کتاب مصنف کے ''پیش لفظ'' اور ''طبع اول کا تعارف'' کے علاوہ کل بیس عنوانات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے ''پیش لفظ'' سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے پہلی اشاعت کا متن کسی ترمیم واضافہ کے بغیر اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھا ہے، وہیں اس اطلاع سے بھی مسرت ہوتی ہے کہ اس میں اشعار کا وہ سہو درست کر دیا گیا ہے جو پہلی اشاعت میں رہ گیا تھا۔ یہاں مصنف نے اس کتاب پر احمد جمال پاشا کا وہ تبصرہ بھی شامل کیا ہے جو اس کی پہلی اشاعت پر لکھا گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اُس تبصرے سے اس کتاب کا مرتبہ بالکل ہی آئینہ ہو جاتا ہے اور احمد جمال پاشا کی اس رائے سے اختلاف کا سوال ہی نہیں رہتا کہ اس میں متوازن تحقیقی بحث اور نفس موضوع پر تفصیل فنی جائزے سے کام لیا گیا ہے جس نے اس کتاب کو طلبا اور دانشوروں کے لئے ایک اہم ادبی تحفہ کے مصداق بنا دیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مصنف نے جہاں ''ملا وجہی: احوال وآثار'' کے تحت وجہی کے عقیدے کی بحث سامنے لایا ہے اور پانچ کتابوں پر مشتمل دس حواشی سے اپنے بیانات کو استحکام بخشا ہے، وہیں تین کتابوں پر مشتمل پانچ حواشی کے ساتھ ''قطب مشتری کا فنی جائزہ'' لیتے ہوئے قاری کو حسب موضوع مباحث سے بخوبی بہرہ ور کیا ہے۔ بعدازیں ''قطب مشتری کا قصہ'' کی گفتگو بھی ضروری دلائل سے تہی داماں نہیں ہے۔

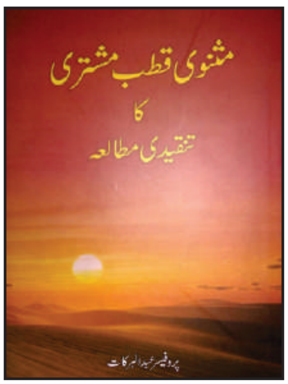

ڈاکٹر عبدالبرکات نے قطب مشتری کے ''پلاٹ'' کی بابت قصہ اور پلاٹ کے فرق اور پلاٹ کے اقسام بتاتے ہوئے، تین کتابوں پر مشتمل سات حواشی کے ساتھ یہ وضاحت کی ہے کہ وجہی کی اس مثنوی کا پلاٹ ناقص، اکہرا اور سپاٹ سہی، لیکن مثنوی نگار کی شاعرانہ مہارت مسلم ہے۔ اسی طرح ''کردار نگاری'' کے تعلق سے یہ بتایا گیا ہے کہ وجہی مثنوی کے کرداروں کی نوک پلک سنوارنے میں خون جگر سے کام نہ لے سکا ہے، پھر مصنف نے ''جذبات نگاری'' کے حوالے سے اس مثنوی کو انسانی جذبات کی پیش کش کا حسین مرقع قرار دیا ہے اور ''منظر نگاری'' کے تعلق سے اس اصطلاح کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ وجہی یہاں منظر نگاری میں فنی لحاظ سے ناکام سہی، مگر اس لحاظ سے کامیاب ضرور ہے کہ اس کی کوشش نقش اول کا درجہ رکھتی ہے۔

مثنوی ''قطب مشتری'' میں ''سراپا نگاری'' پر نگاہ ڈالتے ہوئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ وجہی نے سراپا بیان نہیں کیا بلکہ لفظوں کے گل بوٹے کھلائے ہیں، وہیں ''ماحول نگاری'' کے تعلق سے ایک کتاب پر مشتمل تین حواشی کے ساتھ صریحاً یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں اُس کے عہد کا ماحول نظر نہیں آتا، پھر چار کتابوں پر مشتمل چار حواشی کے ساتھ مصنف نے ''مثنوی قطب مشتری'' کے ''طرز بیان'' پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مثنوی کی زبان میں جدت وندرت بھی ہے وسعت بھی اور رنگارنگی بھی۔ اس طرح اس مثنوی کے اجزائے ترکیبی کا تنقیدی تجزیہ رقم کرنے کے

بعد زیرِنظر کتاب میں طلبا و طالبات کی مزید سہولت اور معلومات کے لئے ''دکن میں مثنوی کا ارتقا'' اور ''اردو مثنوی کا ارتقا'' کے عنوان پر ضروری نکات قلم بند کرتے ہوئے ''اردو مثنویوں میں قطب مشتری کا مقام'' دکھایا گیا ہے اور اس کی ''تاریخی اور ادبی اہمیت'' بھی سامنے لا دی گئی ہے۔

زیرِنظر کتاب کی اس دوسری اشاعت کے اواخر میں جوابات کے ساتھ ''چند معروضی سوالات'' بھی ہیں اور الف سے ی تک ۱۵۲ الفاظ پر مشتمل ''فرہنگ'' بھی اور کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کا اس ایڈیشن میں اضافہ اس کی اہمیت اور افادیت میں روشن اضافہ کے مصداق ہے۔ اس کے بعد ۳۲ کتابوں اور ۳ رسالوں کی تکنیکی تفصیلوں کے ساتھ ''کتابیات'' کا حصہ ملتا ہے جو مصنف کی محنت کا گواہ ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کتاب بنیادی طور پر نصابی مطالعہ میں سہولت کی غرض سے لکھی گئی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ مصنف نے بایں لحاظ سبھی عنوانات کے تحت نہایت ہی مفید تمہید اور واضح اختتامیہ کا اہتمام رکھا ہے اور اس بات کا بھی کہ اس کے بیانات میں صرف جامعیت ہی نہ ہو بلکہ شعوری طور پر مانعیت کا وصف بھی برقرار رہے۔ یہ امید رکھنا یقیناً بے جا نہ ہوگا کہ نہ صرف منتہی طلبا و طالبات کے حلقہ میں بلکہ دکنیات کے مطالعہ کا شوق و شغف رکھنے والے عام قارئین کے درمیان بھی پروفیسر عبدالبرکات کی یہ تصنیف حسبِ سابق، بلکہ اس سے کہیں زیادہ افادیت اور مقبولیت بداماں قرار پائے گی۔

نام کتاب	:	کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر (سفر نامہ حج)
مصنف	:	سلطان آزاد
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۳ء
صفحات	:	۶۴ قیمت : ۱۰۰ روپے
مبصر	:	کاظم رضا

سفر نامہ اردو ادب کی ایک جدید ترین نثری صنف ہے۔ اس میں تخلیق کار سفر میں پیش آنے والے واقعات و حادثات اور مشاہدات و مناظر کو ادیبانہ انداز میں قلم بند کرتا ہے۔ سفر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سیر و سیاحت اور مسافرت کرنے کے ہیں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے۔ السفر وسلیة الظفر یعنی سفر کامیابیوں کا ذریعہ ہے۔ سفر مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور ان کی خصوصیات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک اچھے سفر نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ سفر کی نوعیت کے لحاظ سے اس کے متعلق تمام تجربات و مشاہدات کی روئیداد بیان کی جائے، مثال کے طور پر اگر کوئی سفر، حج و زیارت سے وابستہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس ملک کے کوہ و بیاباں، سمندروں اور چٹیل میدانوں کی کیفیت، کھجور کے پیڑوں کی حالت، زبان، لباس وغیرہ سے آگاہی بخشے، سفر نامہ نہ صرف مختلف مقامات کی سیر کراتا ہے بلکہ مختلف تہذیبوں، زبانوں اور شخصیتوں کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے۔

سفر نامہ دراصل مشرقی ادب کی پیداوار ہے۔ ابن بطوطہ کا سفر نامہ بہت مشہور ہے جو دنیا کے مختلف ممالک، انسانوں کے خیالات و عقائد اور تہذیب و تمدن سے متعارف کراتا ہے۔ سفر نامے میں کئی اصناف کی جھلک ملتی ہے۔ یہاں خاکہ کی بے باکی، انشائیہ کی شگفتگی، خود نوشت کی صداقت، سوانح نگاری کی سادگی، افسانے کا زور اور ناول کی روانی سب کچھ ملتی ہے۔ سفر نامے کا مقصد قارئین کو اپنے تجربات و مشاہدات سے آگہی دینا اور ان کے دلوں میں دیارِ غیر کے سفر اختیار کرنے کے شوق کو ابھارنا ہے اس کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ جب سفر نامے پر ایک زمانہ گزر جائے تو دوسرے عہد کے لوگ اس سفر نامے سے تاریخی، علمی، تہذیبی اور اعتقادی معلومات کو بآسانی اکٹھا کر سکیں۔

اردو زبان میں سب سے پہلا سفر نامہ یوسف خاں کمبل پوش کا ''عجائبات فرنگ'' ہے جو ۱۸۴۷ء میں منظر نامہ پر آیا۔ سفر نامہ نگاری کا سب سے بہترین دور ۱۹۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل ۱۸۷۰ء میں سرسید نے ''مسافرانِ لندن'' اور پھر ان کے معاصرین میں محمد حسین آزاد نے ''سیر ایران''، شبلی نعمانی نے ''سفر نامہ روم و مصر و شام'' لکھا اور اب یہ رواج عام ہو گیا ہے۔ رام لعل، نواب کریم خاں، مسیح الدین، مرزا آغا، شیخ عبدالقادر، عبادت بریلوی، سید سلیمان ندوی، نشاط النساء بیگم، احتشام حسین، عابد حسین اور وزیر آغا اردو زبان کے بہترین سفر نامہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اس وقت میرے پیش نظر جناب سلطان آزاد کا سفرنامہ حج ''کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر'' ہے جو مختصر، لیکن بالکل ہی تازہ سفرنامہ ہے۔ اس میں مصنف نے ان واقعات و مشاہدات کے تعلق سے اپنے ذاتی تاثرات پیش کئے ہیں جو حج و زیارت کے مقدس سفر میں پیش آئے۔ اس کا ''انتساب'' بہ طور شکرانہ اللہ عزوجل کے نام کیا گیا ہے۔ انتساب کے بعد سب سے پہلے ''مناسک حج ایک نظر میں'' کے جدول کو جگہ دی گئی ہے، جس میں ایام حج کے فرائض و مناسک کا اشاریہ موجود ہے۔ اس کے بعد تین صفحات پر اقسام حج اور اس کی اصطلاحات اور پھر دو صفحات پر حج کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں اصل سفرنامے کا آغاز صفحہ اٹھارہ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ چھپن پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں مصنف نے روانگی سے لے کر واپسی تک کی تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس میں چار عمروں کا تذکرہ بھی شامل ہے جو سفرنامہ نگار نے اپنے والدین، اپنی اہلیہ اور اپنے دادا مرحوم کے نام سے ادا کیا ہے۔ مختلف رفقائے سفر کے ساتھ ان مقدس زیارات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو حرمین شریفین میں حاصل ہوئیں، پھر جو زیارتیں وقت کی تنگی کے باعث نہیں ہوسکیں ان پر یہاں اظہار افسوس بھی ہے۔ اخیر میں چار صفحات پر سفر حج و زیارت پر بر سبیل تذکرہ کچھ شکایتوں اور کچھ مشوروں پر مبنی عمومی تبصرہ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد دو صفحات پر مصنف کا شناس نامہ اور پھر دو صفحات پر تصاویر حج کو جگہ دی گئی ہے۔

جناب سلطان آزاد کا یہ ایک دلچسپ سفرنامہ ہے، اس کی زبان سادہ وسلیس اور عام فہم ہے۔ انداز بھی والہانہ ہے، جذبات و احساسات کے اجالے بھی بکھرے پڑے ہیں۔ جا بجا حمدیہ و نعتیہ اشعار کی شمولیت نے اس کی ادبی حیثیت کو مستحکم کر دیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہاں کچھ پہلو سے کمی کا احساس بھی ہوتا ہے مثلاً ایام حج کی تفصیل کے بعد مدینہ طیبہ کی زیارتوں کا تذکرہ الگ سے کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اسی طرح ترتیب میں پہلے پیش لفظ اور تقریظ شامل ہوتی اور پھر دوسری معلومات کو جگہ ملتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ''مناسک حج'' پر نظر ڈالتے ہوئے جس طرح مغرب اور عشاء ایک ساتھ پڑھنے کا ذکر ہوا ہے اسی طرح ظہر و عصر بھی

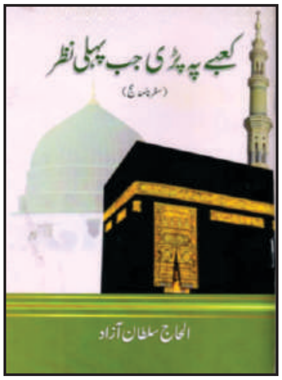

ایک ساتھ پڑھنے اور نیت ادا کے ساتھ پڑھنے کا صاف صاف ذکر ہوتا تو زیادہ مفید تھا۔ کتاب کے صفحہ ۹ پر ''حج کی اہمیت و افادیت'' پر نمبروار لکھتے ہوئے نمبر ۸ اور نمبر ۹ کے تحت یہ بات آئی ہے کہ پہلا حج ہندوستان سے حضرت آدم علیہ السلام نے کیا اور ہندوستان سے پیدل چل کر چالیس حج کیا۔ مصنف نے یہ بات کہاں سے لائی ہے اس کا حوالہ دینا اشد ضروری تھا۔ جیسا کہ ذکر ہوا اس سفرنامہ میں جگہ جگہ برجستہ اشعار کے استعمال سے بڑا ادبی حسن آ گیا ہے، مگر یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ یہاں سفرنامہ نگار نے شاعر کا نام لکھنے کا اہتمام یکساں نہیں رکھا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ خانہ بھی پر کر دیا جاتا اور جگہ جگہ لفظ ''رفع حاجت'' کے استعمال کو ''ضروریات'' یا ''حوائج ضروریہ'' سے بدل دیا جاتا تو مزید حسن آ جاتا۔ اس سفرنامہ کی زبان عام فہم سہی، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کئی جگہ وہ محاورے اور قواعد کی صحت سے محروم ہوگئی ہے۔ اس کی تفصیل لکھنا ضروری نہیں، مگر اس تمنا کا اظہار تو ہونا ہی چاہئے کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔

جناب سلطان آزاد کے اس سفرنامے میں معلومات ہی نہیں، مفید سفر معلومات بھی دستیاب ہیں۔ مثلاً کمر میں بندھے بیلٹ کے بدل جانے سے ہونے والی وقتی پریشانی کا ذکر (ص ۲۰) اور ایک ٹیکسی ڈرائیور سے ملنے والے تجربہ کا بیان (۳۵) سفر میں پیشگی معلومات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ایسی بعض معلومات کی فراہمی اس سفرنامہ کا خاص وصف ہے اور مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بہرصورت یہ مذہبی و ادبی اور معلوماتی سفرنامہ قارئین کے لئے ایک بہترین علمی تحفہ ہے، جس کا مطالعہ نفسیاتی طور پر حج کی تشویق بڑھانے میں بھی کامیاب نظر آتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے بلکہ دلوں میں حج کا بے پایاں شوق بھی پیدا ہوتا ہے۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ مصنف کے حج و زیارت کو شرف قبولیت بخشے اور آئندہ انہیں آلائش زمانہ سے محفوظ بھی رکھے۔ ❀❀

وفیات

آہ! ڈاکٹر امام اعظم

پٹنہ: گزشتہ دنوں جمعرات ۲۳ نومبر ۲۰۲۳ء کو مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد کے کولکاتا (مغربی بنگال) سنٹر کے ریجنل ڈائرکٹر، مشہور و فعال ادیب و ناقد، شاعر اور صحافی ڈاکٹر امام اعظم اِس جہان فانی سے چل بسے انــاللہ الـخ وہ کولکاتا میں اپنی عارضی رہائش گاہ میں محوخواب تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ان کی موت واقع ہوئی۔ ان کا جسد خاکی کولکاتا سے بذریعہ طیارہ دربھنگہ لایا گیا، جہاں ۲۴ نومبر کو بعد نماز جمعہ ان کے آبائی وطن گنگوارہ، دربھنگہ کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ ڈاکٹر امام اعظم کا اصل نام سید اعجاز حسن تھا، لیکن علمی وادبی دنیا میں وہ اپنے قلمی نام سے ہی جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے والد محمد ظفر المنان ظفر فاروقی محکمہ پولس میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ امام اعظم کی ولادت ۴؍جولائی ۱۹۶۰ء کو محلّہ گنگوارہ، دربھنگہ میں ہوئی۔ اپنے والدین سے ابتدائی تعلیم کے بعد ''آمنہ مڈل اسکول'' بتیا سے انہوں نے مڈل اسکول بورڈ کا اور ''اردو ہائی اسکول'' بتیا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، پھر ۱۹۷۷ء میں ایم جے کالج بتیا سے آئی ایس سی اور ۱۹۷۹ء میں ''ملت کالج'' بتیا سے بی ایس سی کرنے کے بعد ۱۹۸۴ء میں متھلا یونیورسٹی دربھنگہ سے ایم اے (اردو) اور اسی یونیورسٹی سے ۱۹۹۱ء میں ایم اے (فارسی) کی سند حاصل کی اور اسی سال متھلا یونیورسٹی سے ان کے مقالہ ''اردو تنقید: ساخت اور ارتقا'' پر انہیں ڈی لٹ کی ڈگری بھی ملی۔ یہ مقالہ انہوں نے پروفیسر سید ضیاء الرحمٰن کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔ اسی دوران ۱۹۸۹ء میں

سی ایم لاء کالج دربھنگہ سے انہوں نے ایل ایل بی کی ڈگری بھی لی اور اسی سال اسی یونیورسٹی سے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی تفویض ہوئی۔ انہوں نے اپنا جامعاتی تحقیقی مقالہ ''مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ'' پروفیسر طیب صدیقی کی نگرانی میں لکھا تھا۔ ڈاکٹر امام اعظم کا یہ مقالہ ۱۹۹۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کی عملی زندگی کا آغاز نومبر ۱۹۹۲ء میں مدھوبنی کے ایک منظور شدہ کالج کی تدریسی ملازمت سے ہوا۔ اس کے بعد ۴؍جولائی ۲۰۰۵ء سے مانو ریجنل سنٹر دربھنگہ کے بانی ریجنل ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے پھر کچھ دنوں پٹنہ کے ریجنل ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ۲۰۱۲ء سے کولکاتا سنٹر کے ڈائرکٹر بنائے گئے اور اسی منصب پر رہتے ہوئے اُن کا وقت موعود آپہنچا۔

مذکورہ مناصب کے علاوہ ڈاکٹر امام اعظم نے قومی کونسل برائے فروغ اردو کے لٹریچر پینل کے رکن اور رکن گرانٹ ان پیڈ کی حیثیت سے بھی اپنی خدمتیں انجام دیں اور ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۱ء تک آکاش وانی دربھنگہ کے پروگرام مشاورتی بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کو ان کی علمی وادبی اور متنوع سماجی خدمات کے سلسلہ میں بہار، اترپردیش اور مغربی بنگال کے مختلف موقر علمی وادبی اداروں کی جانب سے انعامات بھی ملے۔

ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی زندگی تقریباً چار دہائی اور باقاعدہ تصنیفی زندگی تقریباً تین دہائی پر محیط ہے۔ انہوں نے ۱۹۷۵ء سے لکھنا شروع کیا، ابتدا میں وہ اپنے اصل نام سے لکھتے تھے، لیکن جلد ہی انہوں نے قلمی نام سے لکھنے کا سلسلہ قائم کیا جو تادم آخر چلتا رہا۔ ڈاکٹر امام اعظم کی پہلی مرتبہ کتاب ''نصف ملاقات'' ہے جس میں جناب مظہر امام کے نام مرحوم مشاہیر ادب کے خطوط یکجا کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۹۵ء میں ان کی کتاب ''قرابتوں کی دھوپ'' شائع ہوئی جو ان کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اور شعری مجموعہ ''نیلم کی آواز'' بھی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کے ادبی مضامین کا مجموعہ ''گیسوئے تنقید'' (۲۰۰۸ء) اور ''گیسوئے تحریر'' (۲۰۱۱ء) بھی شائع ہو چکا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی کے زیر اہتمام مونوگراف ''ہندوستانی ادب کے معمار: عبدالغفور شہباز'' بھی اشاعت یافتہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اور نثری مجموعہ ''گیسوئے اسلوب'' بھی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتابوں میں ''ہندوستانی فلمیں اور اردو''، ''نامہ نظیر''، ''مولانا عبدالعلیم آسی: تعارف اور کلام''، ''اقبال انصاری: فکشن کا سنگ میل'' وغیرہ شامل ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق ڈیڑھ

☆ ''زبان و ادب'' کا تازہ شمارہ بابت نومبر۲۰۲۳ء موصول ہوا۔ ماہِ اشاعت کے لحاظ سے آپ نے اس میں جو خاص اہتمام کیا ہے اس کے لئے بلاتمہید دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ شمارے کا سرورق اور پس ورق ہی نہیں، دونوں اندرونی سرورق بھی حسن و معنویت سے بھرپور ہے۔ لطف بالائے لطف یہ کہ صرف تصویروں اور سوانحی شذروں سے ہی نہیں بلکہ تحریری عکس اور دستخط کے نمونے سے بھی یہ ہمیں نواز رہا ہے۔ تکنیکی اور طباعتی سہولتوں کے اس دور میں اس نوعیت کا استفادہ صحافتی ژرف نگاہی کا ثبوت ہی کہلائے گا۔ ''مقالات'' کے تحت راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ ''گرہن'' پر ڈاکٹر پرویز شہریار کا، علامہ اقبالؔ کی غزلوں پر جناب ابوالبرکات شاذؔ قاسمی کا اور ''مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی بصیرت'' پر جناب محمد ثناء اللہ کا مضمون بہت ہی کارآمد ہے، پھر ڈاکٹر ندیم احمد کے مضمون ''آزادی کے بعد اردو شاعری پر جدیدیت کے اثرات'' سے بھی کئی اہم نکات ہاتھ آتے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ڈاکٹر عطاؔ عابدی کے قلم سے شوقؔ لکھنوی کی نظم ''سرائے فانی'' کا تجزیہ اور جناب فخر الدین عارفی کے قلم سے علامہ واقفؔ اور ان کے ''واقف آرٹ'' کا تذکرہ بھی پسند آیا۔ محترمہ سعدیہ بانو بھی نیاز فتح پوری کو ایک عظیم صحافی کی حیثیت سے سامنے لانے میں کامیاب ہیں۔ البتہ عرفان صدیقی کی شاعری اور ترجمہ نگاری پر ڈاکٹر محمد ثاقب انور نے جو مضمون لکھا ہے، وہ ایک سرسری مضمون محسوس ہوا۔ ''عروضیات'' کے باب میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلمؔ کے مضمون پر خاص طور سے توجہ گئی اور اس سے استفادہ بھی ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلمؔ صاحب نے بہت آسان اور سادہ انداز میں اسے لکھا ہے، پھر بھی اس کے کئی نکات ٹھیک سے سمجھنے کے لئے استاد فن سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس شمارے کے تمام افسانے عمدہ ہیں اور اپنے ''اداریہ'' میں آپ نے ان پر جو رائے دی ہے وہ بھی بالکل ہی نپی تلی رائے ہے۔ یہاں افسانوں کی جو ترتیب رکھی گئی ہے، وہی میرے نظر میں ان کی پسندیدگی کی ترتیب بھی ہے۔ کہانی کا نکھار نفسیاتی گرہ کشائی سے ہوتا ہے اور یہ وصف سید احمد قادری کی کہانی ''معدوم ہوتی روشنی'' میں بھی ہے، محمد طارق کی ''ریت کی دیواریں'' بھی یہ وصف رکھتی ہیں اور اسلم سلازار کے افسانہ ''مین ہول'' میں بھی اس کی کمی نہیں۔ جہانگیر انس کا طنز و مزاح سے بھرا ''بڑھاپا نامہ'' بھی بہت خوب ہے اور شعری حصہ بھی بہت شاد و آباد۔ تابشؔ ردولوی کے حمدیہ کلام میں حروف مقطعات پر مبنی مصرع نے خاص شان لا دیا ہے اور آہنگ بھی۔ ذاکرہ شبنم اور رابعہ نوری کے قلم سے ''نعت اقدس'' میں بھی مطہر وجد آفریں فضا مل رہی ہے۔ سلطان احمد ساحلؔ، شکیل اخترؔ اور نیلوفر پروین کی نظمیں بھی اپنے اپنے

درجن سے زیادہ کتابیں، اُن کے علم و قلم سے یادگار ہیں۔ ان کی آخری کتاب ''یہی ہے کولکاتا'' ابھی حال ہی میں چھپی تھی۔

تصنیفی اور تالیفی کاموں کے ساتھ ساتھ امام اعظم کا ایک نمایاں کام صحافتی کام ''تمثیل نو'' کی اشاعت بھی ہے، اس مجلّہ کا اجراء دربھنگہ سے مارچ ۲۰۰۱ء میں ہوا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس کے بانی و مدیر کی حیثیت سے اُن کی محنتیں یادگار ہیں۔ امام اعظم کی زندگی اور کارنامے خصوصاً ان کی ادبی و صحافتی خدمات پر ڈاکٹریٹ کے مقالے بھی لکھے گئے ہیں اور ''جہان ادب کے سیاح: امام اعظم'' کے نام سے ڈاکٹر ماجد حسین اور ''ڈاکٹر امام اعظم: اجمالی جائزہ'' کے نام سے ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی کتاب بھی اشاعت پا چکی ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم گاہ گاہی اکادمی مجلّہ ''زبان و ادب'' کو بھی اپنی نگارشات سے نوازا کرتے تھے۔ ابھی اکتوبر۲۰۲۳ء کے شمارے میں ''شمیم قاسمی کی غزل گوئی کا اختصاص'' کے عنوان سے ان کا ایک وقیع مقالہ شائع ہوا تھا، مگر کون جانتا تھا کہ...... بہرحال ہم دعا گو ہیں کہ خدائے پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور اردو ادب و صحافت کی دنیا کو ان کے نعم البدل سے نوازے آمین۔ ❁❁

رنگ میں مطبوعِ خاطر ہیں اور پھر اعجاز مانپوری، آزاد سونی پتی، فہیم سہسرامی، توقیر عالم توقیر، زویا شاہین، مشتاق سیوانی اور منور دانا پوری کی غزلوں سے یہاں جوگلدستہ بنا ہے وہ بھی دلوں کوموہ رہا ہے۔ حافظ محمد تمنا کے ''قطعات'' بھی اچھے لگے۔ ''کتابوں کی دنیا'' میں بدر محمدی کے مجموعہ ''بنت فنون کا رشتہ'' پر شکیل سہسرامی کے تبصرے کا اپنا رنگ ہے اور لطف یہ کہ طوالت کے باوجود یہ رنگ پھیکا نہیں پڑا ہے۔ محمد شکیل استھانوی کی کتاب ''ذکر حیات: حضرت صوفی معالم خاں'' پر ڈاکٹر محمد ممتاز فرخ کا تبصرہ بھی متوازن ہے۔ اسے پڑھ کر ایک فائدہ یہ بھی ملا کہ بزرگوں کے روحانی مراتب اور کرامات پر یقین میں تازگی آ گئی۔ اسی طرح ڈاکٹر منور راہی کی تالیف ''عطا عابدی اور ادب اطفال'' پر ایم احمد توصیف کا تبصرہ بھی بہت پسند آیا، انہوں نے جس انداز سے پوری کتاب کا عطر پیش کر دیا ہے، وہ ان کی محنت اور دقت نظر کا گواہ ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی کی رحلت یقیناً بڑا سانحہ ہے۔ اب ایسی ہستیاں کہاں! ان پر تعزیتی شذرہ صرف تاسف افزا نہیں، معلومات افزا بھی ہے۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' میں محمد غفران کا مضمون ''علامہ اقبال جب بہار آئے'' نہ صرف بچوں کے لئے بلکہ بڑوں کے لئے بھی بہت غنیمت تحریر کہلائے گی۔ موقع کی مناسبت سے بچوں کے چاچا نہرو کو یاد کرنے کی کوشش بھی مفید ہے۔

(ڈاکٹر) محمد ضیاء الدین، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' نومبر ۲۰۲۳ء ملا۔ شمارہ کا سرورق دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ادھر کئی مہینوں سے سرورق میں تبدیلی آئی ہے، اب یہ پہلے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہا ہے۔ اس شمارے کے پہلے اور آخری سرورق کو آزاد اور اقبال کی تحریروں کے ساتھ خوب مزے سے سجایا گیا ہے اور دونوں اندرونی سرورق پر بھی حمید اور شہباز پر مختصر نوٹ اور نمونۂ کلام اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ اس شمارے میں سید احمد قادری کے افسانہ ''معدوم ہوتی روشنی'' کو یوں تو بڑوں کے حصے میں رکھا گیا ہے، لیکن یہ بچوں کے لئے بھی بہت ہی سبق آموز ہے، کیوں کہ اس میں دیوالی کے موقع پر آتش بازی کے حد سے بڑھتے ہوئے شوق اور چلن کو سامنے رکھ کر بچوں کو پردوشن سے بچنے اور آپس میں میل محبت سے رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ دوسرا افسانہ محمد طارق کا ''ریت کی دیواریں'' ہے، اس افسانہ کو پڑھ کر بار بار یہی محسوس ہوتا رہا کہ آج کے دور میں ہر انسان کتنا خود غرض ہو گیا ہے کہ بس اور بس وہ اپنے ہی بارے میں سوچا کرتا ہے۔ ''مین ہول'' اسلم سلازار نے لکھا ہے۔ دوسروں کے لئے گڑھا کھودنے والا خود دگڑھے میں گرے یا نہ گرے کھودنے والے کو احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ میں نے جو گڑھا کھودا ہے اس میں کہیں میرا بیٹا ہی نہ گر جائے۔ اس شمارے کی نعت اور غزلیں بھی بہت اچھی ہیں اور کتابوں پر تبصرے بھی بہت اچھے ہیں۔ خصوصاً ''عطا عابدی اور ادب اطفال'' پر ایم احمد توصیف کا تبصرہ ایسا لگتا ہے کہ مبصر نے کتاب کے ایک ایک ورق کا مطالعہ کیا ہے تبھی تو پوری ترتیب اور ضروری تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے ایک ایک باب کی بات کی ہے۔ اس شمارے کے دیگر تبصرے بھی محنت سے تحریر ہوئے ہیں۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی یہاں اپنی الگ بہار دکھا رہا ہے۔ حشمت کمال پاشا نے عنوان تو لگایا ہے ''ایک بھول''، لیکن موتی لال کی نصیحت اور اپنے بیٹے کو سزا بچوں کو یہ سبق دے رہی ہے کہ چوری نہیں کرنا ہے اور جھوٹ نہیں بولنا ہے۔ پرویز اختر کی کہانی ''چاچا نہرو'' میں بچوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ خود کا کام خود سے کرنا چاہئے۔ غفران احمد نے ''علامہ اقبال جب بہار آئے'' میں بھی بچوں کو بہت خاص معلومات دیا ہے اور شاذیہ ترنم نے بھی اپنے مضمون میں بہت ہی اچھی نصیحت بھری بات لکھی ہے۔

درخشاں جبیں، پٹنہ

☆ نومبر ۲۰۲۳ء کا ''زبان وادب'' ملا۔ پرچہ سچ مچ بہت خوبصورت ہے۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ آٹھ رنگین صفحات میں ایسا لگا کہ کسی نگینے کے آٹھ پہل چمک رہے ہیں۔ پہلے دو صفحہ میں جناب حشمت کمال پاشا کی کہانی ''ایک بھول'' اور ڈاکٹر نریش کی نظم ''کھیل کے اصول'' پڑھنے کو ملی۔ پاشا صاحب کی کہانی اصل میں پنڈت نہرو کے بچپن کی کہانی ہے جو انہوں نے خود ہی اپنی سوانح میں لکھا ہے، ڈاکٹر حشمت پاشا نے اس کہانی کے آخر میں سوچنے کی جو بات لکھی ہے، وہی اصل مدعا ہے۔ یہاں جو پیغام ہمیں

مل رہا ہے وہ یہی ہے کہ وقت پر اچھی تربیت اور پھر اپنا سوچنے سمجھنے کا مزاج ہی آنے والے دنوں میں آدمی کو بڑا اور کامیاب آدمی بنادیتا ہے۔ڈاکٹر نریش کی نظم میں بھی بڑے پتے کی بات مل رہی ہے کہ ؎

بچو! کھیلو ایسے کھیل
جس سے بڑھے آپس میں میل

یقیناً کھیل کھیل میں لڑائی کبھی اچھی بات نہیں ہوتی۔کھیل تو دل خوش کرنے اور آپس کی محبت بڑھانے کے لئے ہوتا ہے۔اس سے جسمانی ورزش بھی ہوتی ہے اور ذہن بھی بڑھتا ہے۔اس نظم میں مذہب اور ذات پات کے بھید بھاؤ سے دور رہنے کا جو سبق شاعر نے یاد دلایا ہے، وہ بھی بہت اہم ہے۔اس بار کے پرچے کا سب سے شاندار معلوماتی مضمون، میرے خیال سے محمد غفران کا ہے اور اسے علامہ اقبالؔ کی تصویر اور ان کی تحریر ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کے ساتھ آپ نے بہت قاعدے اور خوبصورتی سے سجایا بھی ہے۔مضمون کا عنوان بھی بہت اچھا اور متوجہ کر لینے والا ہے کہ ''علامہ اقبالؔ جب بہار آئے''۔واقعی یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ایک ہی دو دن کے لئے اور کسی مقدمہ کے سلسلے میں ہی سہی، علامہ اقبال بہار (پٹنہ) آئے تھے۔جناب غفران بہت بہت مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے حوالے کے ساتھ اتنا اچھا اور اچھوتا مضمون لکھا اور اس کے اخلاقی سبق کی طرف بھی ہمیں دھیان دلایا۔ان کا یہ جملہ بہت قیمتی ہے کہ ''بڑے قلم کار اپنے کردار میں بھی ہمیشہ بڑے ہی رہتے ہیں۔''اس حصے میں فیلر تو بس ایک ہی ہے، لیکن اس سے اس سوال کا مطلب کھل کر نکل آتا ہے کہ ''خودداری کیا ہے؟'' جناب پرویز اختر نے ''چاچا نہرو'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے وہ بھی بہت پسند آیا، پھر جناب عبدالرزاق دلؔ کھولا پوری کی نظم ''نیند: ایک نعت'' بھی بہت اچھی لگی اور اس میں بھی شک نہیں کہ ڈاکٹر التفات امجدی نے بچوں کے لئے جو ''غزل'' لکھی ہے، وہ بھی بہت مزیدار ہے۔یہاں محترمہ شاذیہ ترنم کا مضمون ''پیاری امی، پیارے ابو'' بھی اپنے طرز میں بہت پیارا ہے۔انہوں نے ماں باپ کی عزت اور خدمت کا جو سبق یاد دلایا ہے اور جس انداز سے یاد دلایا ہے وہ یقیناً متاثر کرتا ہے۔اس سبق پر عمل کرنے میں ہی کامیابی ہے۔مختصر یہ کہ نومبر کے مہینے کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ نے خاص طور سے یہ شمارہ تیار کیا ہے، جسے دیکھ کر اور پڑھ کر سچ مچ کچھ ایسی ہی خوشی ہوئی جیسے کوئی بہت پیارا سا تحفہ ملنے سے ہوتی ہے۔زیادہ خدا حافظ!

محمد سعد، مظفر پور

☆ ''زبان وادب'' اکتوبر ۲۰۲۳ء نظر نواز ہوا۔تمام مشمولات میں چار افسانے اپنی اپنی جگہ بنائے ہوئے ہیں جن کے فنکار بالترتیب پروفیسر اسلم جمشید پوری، ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری، سلیم سرفراز اور افتخار عظیم چاند ہیں۔ان میں پروفیسر اسلم جمشید پوری صاحب کا جواب نہیں ہے۔یہاں ''فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' کو بے حد اچھے انداز و بیانیہ میں واضح کیا گیا ہے اور وضاحت میں بابا کا سہارا لیا گیا ہے۔جناب حبیب ریتھ پوری نے سیدھے سادے پلاٹ میں ''سادگی میں سمادھان'' کی ڈٹ کر پیروی کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔سلیم سرفراز ''تین مشت خاک'' کے ذریعہ اپنی امیج قائم کرنے میں کامیاب و کامران ہیں۔افسانہ کچھ طوالت لئے ہوئے ہے، لیکن پھر بھی قاری اُن کی اُنگلی نہیں بلکہ ہاتھ تھامے چلنے کو تیار نظر آتا ہے۔اس کہانی کا بیانیہ بھی بہت عمدہ ہے۔اس شمارے میں کئی مقالے بھی اپنی اپنی جگہ بنائے ہوئے ہیں۔منظوم مواد میں وارثؔ رفیع کی دونوں غزلیں پسند آئیں اور جناب خالد عبادیؔ کی رباعیاں بھی اچھی ہیں۔''کتابوں کی دنیا'' کے تحت جناب خالد عبادیؔ کی کتاب ''نہایت''، پر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر شکیل احمد کی کتاب ''مئو: شہر ہنروراں''، پر ڈاکٹر رفیق احمد کے تبصرے عرق ریزی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔آپ کا رسالہ دن بہ دن نیا پن لا رہا ہے۔خدا اسے نظر بد سے بچائے، آمین!

صادق علی انصاری، سیتاپور

☆ الحمدللہ! ''زبان وادب'' پابندی سے مل رہا ہے۔فی الحال ماہ اکتوبر ۲۰۲۳ء کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔اس ماہ کی مناسبت سے سرورق پر بابائے قوم مہاتما گاندھی کی چرخہ سے سوت کاٹنے کی منھ بولتی تصویر دیکھ کر دل عقیدت سے بھر آیا۔زیر نظر شمارے میں پہلا مقالہ صوفیانہ

شاعری پر مبنی ہے جس کا عنوان ''صوفیانہ شاعری کے سرخیل: خواجہ بندہ نواز گیسودراز'' ہے۔اس کے لکھنے والے ڈاکٹر مختار علی ہیں۔اس کے بعد ظہیر محمد صاحب نے ''سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری: چند نکات'' کے حوالے سے دکن کے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے چند نکات پر روشنی ڈالی ہے، اسی مناسبت سے کتاب کے پشت پر بھی سلطان قطب شاہ کی رنگین تصویر کے ساتھ ان کی مشہور غزل کے چند اشعار کو شائع کیا گیا ہے۔محمد مستقیم نے ''غالبؔ کی فارسی رباعیوں کا مستقبل'' کے حوالے سے حسب موضوع باتیں کی ہیں۔ یہاں اشعار چونکہ معنی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس لئے بہت ساری باتیں با آسانی سمجھ میں آگئیں کہ غالبؔ کی فارسی رباعیوں کا مستقبل کیسا ہوگا یا وہ ان کے ذریعہ کیا کہنا چاہتے تھے۔اس کے بعد رئیس الدین رئیسؔ کا مضمون ''مجروحؔ کی شاعری میں سیاسی اور انقلابی رمزیت'' بھی لائق مطالعہ ہے۔ڈاکٹر امام اعظم کا مضمون ''شمیمؔ قاسمی کی غزل گوئی کا اختصاص'' بھی اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کر رہا ہے۔بقیہ مضامین بھی قابل مطالعہ اور لائق تحسین ہیں۔سب سے اہم بات یہ کہ مقالات کے حصے میں ایسے موضوعات کو شامل کیا گیا ہے جو جامعات میں پڑھنے والے طلبہ کے نصاب میں شامل ہیں اور ان میں سے مقابلہ جاتی امتحانات میں سوالات بھی پوچھے جاتے ہیں۔ اس طرح گویا مقالوں کی افادیت دو چند ہوگئی ہے۔اس شمارے میں میرے مضمون ''باپو: اردو شعر و ادب میں'' کو بھی جگہ دی گئی ہے جس کے لئے میں بے حد مشکور ہوں۔افسانوں کے حصے میں پہلا افسانہ پروفیسر اسلم جمشید پوری کا ''فَبِاَیِّ آلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' ہے، جس میں ایک فقیر کے ذریعہ اللہ کی قدرت، اس کی رحمت، اس کی بے پایاں عنایت اور اس فنا ہوجانے والی دنیا کی بے ثباتی کی بات ہوئی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ فقیر کو ہر بات کا الہام ہے وہ خدا سے باتیں کر رہا ہے، اس کے غضب سے ڈر رہا ہے اور لوگوں کو بھی ان سے آگاہ کرنا چاہتا ہے، اسے کسی بھی چیز کا لالچ نہیں، دنیا فانی ہے تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ دوسرا افسانہ ''سادگی میں سمادھان'' بھی امرا و رؤسا پر خاموش طنز ہے جو دن رات پیسہ کمانے اور دولت جٹانے کی ہوڑ میں لگے رہتے ہیں۔پیسے کی بدولت آسائش کی ہر چیز تو جٹا لیتے ہیں، لیکن وہ اطمینان اور سکون انہیں نصیب نہیں ہوتا جو فٹ پاتھ پر سامان لگانے والے تہواری دکانداروں کے دل میں ہوا کرتا ہے کہ وہ تو غریبی کے باوجود اپنی قناعت پسندی میں خوش رہتے ہیں اور اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں۔''تین مشت خاک'' سلیم پرویز کا لکھا اچھا افسانہ ہے۔آپسی میل محبت، قومی یکجہتی اور بھائی چارے کا پیغام دیتی ہوئی یہ ایک سیکولر کہانی ہے۔نہ کوئی بھید بھاؤ نہ آپسی رنجش، نہ کوئی دھرم، نہ مذہب، لیکن بڑے ہونے پر یکسر یہ چیزیں بدل جاتی ہیں یا بعض اوقات حالات انسان کے بس میں نہیں ہوتے۔اس حصے کی آخری کہانی ''گناہوں کا کفارہ'' ہے جو گرتی ہوئی انسانیت اور خون کے رشتوں پر کاری ضرب لگاتی ہے، انسان اپنی حرکتوں سے اتنا گر جاتا ہے کہ اسے کسی چیز کی تمیز ہی نہیں رہ جاتی اور وہ پوری طرح سے شیطان کے شکنجے میں پھنس کر حیوانیت کا مظاہرہ کرتا ہے، پھر جب کبھی آنکھ کھلتی ہے تو گناہ اور ثواب کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے، لیکن تب تک بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے۔یہ کہانی پڑھ کر میرے اندرون سے ایک آواز بار بار آتی ہے کہ اس طرح کے گناہوں کا کفارہ ادا ہوسکتا ہے کیا......؟ منظومات کا گوشہ بھی بہت خوبصورت غزلوں سے آراستہ ہے۔ مجھے اسدؔ رضوی اور استاد محترم شہاب ظفر اعظمی کی غزلیں پسند آئیں۔کتابوں کی دنیا میں ''رباعیات عابدؔہ شیخ'' کی رباعیاں کافی دلچسپ لگیں اور دل میں اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی خواہش بھی جاگ اُٹھی، لیکن ۱۲۴ صفحات کے لحاظ سے کتاب کی قیمت پانچ سو روپے بہرحال گراں بار ہے۔اس شمارے میں بچوں کا گوشہ بھی ہر بار کی طرح نئی معلومات اور نصیحت آموزی سے مزین ہے۔محمود اختر جلالپوری نہ صرف بچوں کی تعلیم کے لئے خود فکرمند ہیں بلکہ بچوں کو بھی اس طرف سوچنے کے لئے مجبور کرتے ہیں کہ ہمیں علم کی دولت کیسے حاصل کرنی ہے اور اس کے لئے ہر حال میں ہمیں کس طرح سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔عائشہ رفعت نے میزائل مین کو اپنے بچپن میں دیکھا اور ان کے تعلق سے کئی اہم باتیں بھی ہم سے شیئر کیں۔ان کی باتوں سے یادوں کو بھی تحریری طور پر سمیٹنے کا درس ملتا

ہے اور کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے کا بھی حوصلہ مل رہا ہے۔انہیں بہت بہت مبارکباد! جناب خالد رحیم کی نظم ''سچ کہنے کی عادت ڈالو'' بھی سہل اور آسان الفاظ میں بچوں کے لئے بہت اچھی اور نصیحت آموز نظم ہے۔ امتیاز احمد انصاری کا مضمون پڑھ کر بینک کے بارے میں کافی مفید باتیں معلوم ہوئیں۔ یہ باتیں بچوں اور بڑوں دونوں کو ذہن نشین کر لینی چاہئے۔ ملک کے دوسرے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے بچپن کی حوصلہ افزا باتوں کو محترمہ درخشاں صاحبہ نے بڑے سہل انداز میں بتایا ہے۔ شاذیہ ترنم کا مضمون بھی سبق آموز ہے، خوبصورت گیٹ اَپ کے ساتھ مزین رسالہ دن بہ دن اپنے معیار کو بڑھا رہا ہے۔اللہ اس میں اور چار چاند لگائے۔آمین!

(ڈاکٹر) نشاط اختر، ویشالی

☆ اکتوبر ۲۰۲۳ء کا ''زبان وادب'' ملا، اداریہ مختصر، مگر جامع ہے، مضامین کے حصہ میں ڈاکٹر مختار علی، جناب رئیس الدین رئیس، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر نشاط اختر اور منظر رینڈھوی کی تحریریں یقیناً قابل قدر اور قابل مطالعہ ہیں۔ افسانوی حصہ میں پروفیسر اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''فَبِاَیِّ آلاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن'' حاصل شمارہ ہے۔''سادگی میں سمادھان''، ''تین مشت خاک'' اور ''گناہوں کا کفارہ'' بھی پسند آیا۔ جناب جوہر نوری کی نعت پاک بھی اچھی ہے اور اسد رضوی، شہاب ظفر اعظمی، طلحہ تابش، جبیں نازاں اور سلطان مظفر آزاد کی غزلیہ تخلیقات اور جناب خالد عبادی کی رباعیات بھی اچھی ہیں اور ''تبصرے'' بھی عمدہ ہیں۔''بچوں کا زبان وادب'' کی شعری ونثری تخلیقات بھی سبق آموز ہیں۔خدا کرے آپ کی ادارت میں رسالہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کے منازل طے کرتا رہے آمین۔

فردوس گیاوی، گیا

☆ ''زبان و ادب'' اکتوبر ۲۰۲۳ء کا شمارہ موصول ہوا۔ رسالہ میں مضامین کی ترتیب بے حد دلکش ہے۔ رسالے کا سب سے پہلا مضمون ''صوفیانہ شاعری کے سرخیل: خواجہ بندہ نواز گیسودراز'' ہے جس میں ڈاکٹر مختار احمد، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی صوفیانہ شاعری کا تجزیہ پیش کرنے میں بہت ہی کامیاب نظر آتے ہیں۔اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کی خصوصیات بیان کرنے میں ظہیر محمد صاحب نے نہایت عرق ریزی سے کام لیا ہے۔محمد مستقیم کا مضمون ''غالب کی فارسی رباعیوں کا مستقبل'' بھی نہایت عمدہ ہے۔رئیس الدین رئیس کا مضمون ''مجروح کی شاعری میں سیاسی اور انقلابی رمزیت'' بھی ایک قابل قدر مضمون ہے، لیکن انہوں نے اپنے مضمون میں حوالوں کو پیش نہیں کیا ہے، البتہ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے مضمون میں ''شمیم قاسمی کی غزل گوئی کا اختصاص'' نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔''غزل کا مزاج داں! نیر قریشی گنگوہی'' بھی قابل تحسین مقالہ ہے جس میں پروفیسر عرفان آصف نے نیر قریشی گنگوہی کی غزلوں کے محاسن نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پروفیسر شہزادی کا مضمون ''مظفر حنفی کے افسانوں کی جہتیں'' کافی پسند آیا جو بہت محنت سے تحریر کیا گیا ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ مقالہ ذرا طویل ہو گیا ہے۔ڈاکٹر نشاط اختر کا مقالہ ''باپو: اردو شعر وادب میں'' نہایت اہمیت کا حامل ہے۔منظر ریونڈھی نے فراق گورکھپوری کے اندازِ بیان کو اجاگر کیا ہے جو قابل تعریف ہے۔ جمیلہ بی بی کا مقالہ ''قمر رئیس کی ناول فہمی: خواتین کرداروں کی روشنی میں'' بے حد دلچسپ ہے۔افسانوں کے حصے میں پروفیسر اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''فَبِاَیِّ آلاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن'' بے حد متاثر کرتا ہے۔یہ افسانہ ان ناشکرے لوگوں کے لئے ایک مشعل راہ ہے جنہیں خدا کی نعمتوں کا احساس نہیں ہے۔افتخار عظیم چاند کا افسانہ ''گناہوں کا کفارہ'' نہایت درد انگیز ہے جس کو پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ افسانہ بلاشبہ ہمارے ذہن پر اپنا دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری کا افسانہ ''سادگی میں سمادھان'' اور سلیم سرفراز کا افسانہ ''تین مشت خاک'' بھی خوب ہے۔حصہ ''منظومات'' میں جوہر نوری کی نعت بہت مسحور کن ہے۔وارث رفیع، طلحہ تابش، جبیں نازاں، سلطان مظفر آزاد، اسد رضوی، شہاب ظفر اعظمی اور ڈاکٹر محمد ضمیر رضا کی غزلیں بے حد پسند آئیں خصوصاً شہاب ظفر اعظمی کا یہ شعر کافی متاثر کن ہے ؎

ساری بستی کا وہ محافظ تھا
کل جسے ہم نے سنگسار کیا

یہ سادہ سا شعر واقعی اس دنیا کی تلخیاں محسوس کرنے پر ہمیں مجبور کر رہا ہے۔ خالد عبّادی کی رباعیاں بھی خوب سے خوب تر ہیں جو ہمارے ذہن پر اپنا نقش چھوڑتی ہیں۔ خالد عبّادی کی کتاب ''نہایت'' پر علی احمد فاطمی نے تفصیل سے تبصرہ کیا ہے جو نہایت جامع ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی بہت خوبصورتی سے ترتیب پایا ہے، اس میں جتنے بھی مضامین، نظمیں اور کہانیاں ہیں، وہ سب بے حد معلوماتی اور سبق آموز ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ رسالہ ترقی کی منزلوں پر گامزن رہے اور ہماری معلومات میں اضافہ کرتا رہے۔

شبنم پروین، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' ستمبر ۲۰۲۳ء نظر نواز ہوا۔ ''حرف آغاز'' کے بعد ''مقالات'' کے ذیل میں پہلا مقالہ بعنوان ''شین مظفر پوری کے افسانوں میں احتجاج'' از ڈاکٹر احمد صغیر ہے جس میں گیارہ افسانوں کی فہرست کی بنیاد پر مقالہ نگار اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ شین صاحب بسیار نویس تھے۔ دوسری بات یہ کہ ''شمع'' اور ''بیسویں صدی'' جیسے مشہور زمانہ اور ادبی رسائل کو مقالہ نگار نے غیر معیاری لکھا ہے۔ اس سے خود مصنف کے معیار مطالعہ کا اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال مضمون تمام تر مدافعتی اور حد درجہ ستائشی ہے۔ دوسرا مقالہ ''قمر رئیس کی ترجمہ نگاری: از بیکستان کے حوالے سے'' ڈاکٹر صابر علی سیوانی کا لکھا ہوا ہے۔ اس مقالہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے زبان میں اعتدال اور پیش کش میں عمدگی ہے۔ ابتدا میں ترجمہ کے عمل کی وضاحت ہے اور یہ بھی وضاحت شامل ہے کہ ڈاکٹر قمر رئیس استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل ترجمہ نگار بھی تھے کہ انہوں نے ازبیکی زبان کی ادبیات کو اردو میں بڑی مہارت سے منتقل کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد بشیر الدین نے ''ودیا ساگر آنند کی ہائیکو نگاری'' پر بحث کی ہے۔ ساتھ ہی جاپانی صنف سخن ہائیکو کی بھی سیر حاصل صراحت کی ہے۔ بڑا خوب مضمون ہے پڑھنے کے لائق۔ بقیہ مقالات میں ڈاکٹر محمد شارب کا مقالہ ''اکبر کی شاعری کے چند اہم پہلو'' اور ڈاکٹر صفیہ عرفانہ کا مقالہ ''جدید اُردو افسانے میں سماجی وثقافتی جہات: ایک جائزہ'' طویل ضرور ہے، مگر علم وادب سے معمور ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مضامین بھی اچھے اور قابل قبول ہیں۔ ''افسانے'' میں دو افسانے شامل ہیں۔ پہلا ڈاکٹر قمر جہاں کا لکھا ہوا افسانہ ''ڈوبتا سورج'' واجبی سا افسانہ ہے۔ اس کے مکالمے واردات وواقعات کا ساتھ نہیں دیتے۔ دوسرا افسانہ ''سپر نانی'' اچھا افسانہ یوں ہے کہ یہ افسانوی طرز ادا لیے ہوئے ہے۔ پڑھنے والا جو سوچتا ہے ویسا نہیں ہوتا، یہی افسانوی رنگت ہے۔ انشائیہ ''تصویر'' میں محض الفاظ کا الٹ پھیر نظر آیا۔ کوئی کام کی بات ہوتی تو انشائیہ کا تقاضہ پورا ہوتا۔ ندیم جعفری، خوشبو پروین، نوشاد ناداں اور نزہت پروین کی غزلوں نے متاثر کیا۔ ''بچوں کا زبان وادب'' میں دو اچھی نظمیں اور چار اچھے اسباق شامل ہیں۔ اس طرح یہ شمارہ کئی خوبیوں سے معمور ہے۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری، اورنگ آباد، (مہاراشٹرا)

☆ میری ایک کزن پٹنہ سے آئی ہوئی تھیں، انہیں سے ''زبان وادب'' ستمبر ۲۰۲۳ء ملا۔ پہلی بار یہ پرچہ دیکھا، بہت اچھا میگزین نکالتے ہیں آپ لوگ۔ آپ کے یہاں خطوط کا کالم ہے تو سوچا، چند سطروں میں اپنا خیال لکھ بھیجوں۔ اس پرچے کی کہانی ''سپر نانی'' (شکیلہ نگار) بڑی ہی شاندار ہے۔ عظیم اقبال کا انشائیہ ''تصویر بھی مزے دے گیا'' آپ نے رسالے میں جگہ جگہ فیلرز بھی دیا ہے۔ کم وقت اور ایک نظر میں یہ بھی پڑھنے کے لئے بہت کارآمد اور دلچسپ چیز ہے۔ شاعری کا حصہ بھی ورق ورق پڑھا اور لطف ملتا رہا۔ بچوں کا حصہ بھی صرف رنگین ہی نہیں کافی دلچسپ ہے۔

زینب بانو، چھتیس گڑھ

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	چڑیا کی چونچ	نوشین تبسم	۷۴
☆	وقت	مناظر حسن شاہین	۷۵
☆	ڈاکٹر راجندر پرشاد	زیبا راشد	۷۶
☆	اِس اور اُس	محمد ریحان	۷۷
☆	لوٹ کے بدھو گھر کو آئے	شجاع الدین شاہد	۷۸
☆	......جب دادی ماں نے سمجھایا	کائنات ضیا	۷۹

نوشین تبسم
Al-hira Public School, Sharif Colony, Patna - 800006 (Mob. 8804810538)

چڑیا کی چونچ

''مجھے دادی ماں کی گود میں بیٹھنا ہے۔''

''نہیں......، مجھے بیٹھنا ہے۔''

''نہیں مجھے......''

بچوں کی تکرار اور آپس میں نوک جھونک بڑھتی ہی جارہی تھی اور عدنان کی وہی پرانی فرمائش:

''دادی اماں! آج پھر سے چڑیا کی چونچ والی کہانی سنائیے۔''

''عدی کتنی بار تم اس کہانی کو سنو گے۔ دادی اماں آج کوئی دوسری کہانی سنائیے۔'' سنبل نے بھائی کی خواہش پر اعتراض کیا اور دادی کے سامنے بڑی سادگی سے اپنی بات رکھی۔

''دادی اماں اگر آپ چڑیا کی چونچ والی کہانی نہیں سنائیں گی تو میں روٹھ جاؤں گا، پھر سبق بھی یاد نہیں کروں گا۔ کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔'' عدنان نے اپنی سمجھ سے خوب خوب دھمکی دے ڈالی۔

''عدی اتنی ضد نہیں کرتے۔ دیکھو نائلہ، آمنہ، عدیل، منیب، ذکریٰ، منیبہ، سنبل سب تمہاری ضد دیکھ رہے ہیں۔'' ماں نے بیٹے کو ہلکی سی تنبیہ کی۔

''اگر دادی اماں نے چڑیا کی چونچ والی کہانی نہیں سنائی تو میں ابو جان سے بات نہیں کروں گا۔'' عدی میاں نے اپنی دانست میں ایک بار پھر اپنی بات منوانے کی بھرپور کوشش کی۔

''سنو بچو! آج عدنان میاں کی خواہش پر پھر سے وہ کہانی سن لو۔'' دادی اماں نے سارے بچوں کو اپنے اردگرد اور قریب کرلیا۔

''ہاں ...... ہاں'' سبھی بچوں نے خوشی خوشی تالی بجا کر رضامندی کا اظہار کیا اور پھر کہانی شروع ہوئی:

''ایک باغ تھا، بہت خوبصورت۔ اس باغ میں بہت سے پیڑ پودے تھے۔ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ درمیان میں آبشار تھا، رنگ برنگے پھولوں سے بھرے اس باغ میں خوبصورت ننھی ننھی چڑیاں رہا کرتی تھیں۔ پیاری پیاری تتلیاں بھی اس باغ کی سیر کو آیا کرتی تھیں۔''

''......اور مجھے یاد ہے۔ وہاں پریاں بھی آیا کرتی تھیں۔'' آمنہ نے مکمل وثوق سے یاد دلایا۔

''آمنہ کی بچی تو چپ کر، دادی اماں آپ سنائیں۔'' دادی کے لاڈلے عدی نے ٹھنک کر کہا۔

''ہاں تو وہاں ہر رات پریاں آتیں اور ہواؤں سے تازگی، پھولوں سے خوشبو، آبشار سے ٹھنڈک اور چڑیوں سے چہک لے کر لوٹ جاتیں۔ اس طرح چڑیوں اور پریوں کی دوستی ہوگئی۔ ایک دن کی بات ہے، پریوں نے چڑیوں سے اپنے نگر چلنے کو کہا، سبھی چڑیاں خوشی خوشی راضی ہوگئیں، ان میں ایک ننھی چڑیا بھی تھی جو ان سب کے ساتھ اڑ نہ سکی، پیچھے چھوٹ گئی اور باغ میں تنہا بیٹھی روتے روتے سوگئی۔ تھوڑی دیر گزری کہ ننھی چڑیا جاگ پڑی۔''

''دادی اماں دادی اماں عدی سو گیا۔ اب آپ کوئی دوسری کہانی سنائیں۔'' ننھی منیبہ نے دادی کے کان میں سرگوشی کی۔

''دادی اماں، سنائے نا، ننھی چڑیا جاگ گئی تو پھر کیا ہوا'' عدی نے نیند سے بوجھل آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی۔

''اب چڑیا کو بھوک لگی اور اس نے کھانے کی تلاش شروع کی۔ وہ ادھر سے اُدھر اڑ رہی تھی۔ تبھی اس کی نظر باغ میں بنے بڑے سے چبوترے پر پڑی اور وہ ڈر سے شہتوت کے پتوں میں چھپ گئی۔ اُسے لگا تھا، وہاں کوئی شکاری ہے، پھر تھوڑی دیر میں اسے سمجھ آئی کہ یہ تو ننھے ننھے بچے ہیں۔ ان میں ایک چھوٹی بچی تھی۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی پرانی سی فراک کو بار بار کھینچ کر کبھی اپنے پیر چھپانے کی کوشش کرتی، کبھی ٹھنڈ سے بچنے کے لئے وہ خود میں سمٹ سمٹ کر بالکل گول سی ہوجاتی۔ یہ سب

مناظر حسن شاہیںؔ

Makan No.60, Millat Colony, Gaya - 823001 (Mob. 9661214111)

وقت

وقت کے ہاتھ میں زمانہ ہے
وقت اک قیمتی خزانہ ہے

وقت تو اک سرکتا سایہ ہے
وقت کو کون روک پایا ہے

وقت کے ساتھ چل نہیں سکتے
وہ بہاروں میں پل نہیں سکتے

سیاہ راتوں میں چاندنی کرنے
وقت آتا ہے دوستی کرنے

قدر ہم جان ہی نہیں پاتے
اس کو پہچان ہی نہیں پاتے

خوابِ غفلت میں ہم کو پاتا ہے
دستکیں دے کے لوٹ جاتا ہے

اس لئے میرے نونہالِ چمن
رشک گلزار ، فخر و نازِ وطن

بات شاہیںؔ کی ذرا مانو
قدر و قیمت تم اس کی پہچانو

علم سے نیکیاں کماؤ تم
وقت بے کار مت گنواؤ تم

وقت ہی زندگی کا حاصل ہے
یہ جہاں موج ، وقت ساحل ہے

❀❀❀

دیکھ کر چھوٹی چڑیا کو رحم آ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ بچے ٹھنڈ سے ٹھٹھر رہے ہیں۔ ان کے امی ابو نہیں ہوں گے اور ان کے پاس کھانے کو بھی نہیں ہوگا۔ اب ننھی چڑیا کا ڈر اور اپنی بھوک کہیں اور بھاگ گئی تھی۔''

''اور تب آ گے......دادی اماں۔'' ذکریٰ بولی وہاں تب وہ شاخ سے اڑ کر ان بچوں کے پاس گئی اور آس پاس گرے ہوئے پتے اپنی ننھی منی چونچ سے اٹھا اٹھا کر دونوں بچوں کو اوڑھانا شروع کر دیا۔ بہت دیر کی مسلسل محنت کے بعد ننھی چھوٹی چڑیا دونوں بچوں کو باغ کے پتوں سے ڈھانپنے میں کامیاب ہوگئی تو اسے خیال آیا کہ بچے جب نیند سے جاگیں گے تو انہیں بھوک لگے گی۔ وہ تو شہتوت بہت شوق سے کھاتے ہیں، لہٰذا وہ ان کے کھانے کے انتظام میں جٹ گئی اور اپنی پیاری پیاری چونچ سے ڈھیر سارے شہتوت بچوں کے قریب اکٹھا کر دیا۔ یہ سب کرتے کرتے اب ننھی چڑیا نڈھال ہوگئی تھی۔ صبح ہونے والی تھی پر یوں کے نگر گئی ساری چڑیاں واپس باغ میں لوٹ رہی تھیں، چھوٹی چڑیا سے ساری بات جان کر وہ اللہ کے شکرانے میں ایک ساتھ چہچہانے لگیں کہ اس کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ دونوں بچے بھی اللہ کا نام لیتے ہوئے جاگ گئے تھے۔''

کہانی سنا کر دادی اماں نے پوچھا:

''کچھ بات سمجھ میں آئی؟''

''ہاں! دادی ماں! چڑیا کی چونچ کا کمال''

ننھے منیب نے کہا:

''ارے نہیں اس کے جذبے کا کمال......تمہیں اپنے اندر سدا یہی جذبہ رکھنا ہے......''

❀❀

زیبا راشد
Deewan Mohalla, Patna City, Patna - 800008

ڈاکٹر راجندر پرشاد

بچو ــــ! اس وقت صدر جمہوریہ ہند عزت مآب دروپدی مرمو ہیں جو پندرھویں صدر جمہوریہ ہیں۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ عزت مآب دروپدی مرمو پندرھویں صدر جمہوریہ ہیں، تو پہلے صدر جمہوریہ کون بنے؟ آیئے آج میں آپ کو پہلے صدر جمہوریہ کے بارے میں بتاتا ہوں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کو آزادی ملی تو اس کے بعد ہندوستان کا قانون بننے کی مہم شروع ہوئی۔ اس وقت کے بڑے رہنماؤں کی جدوجہد اور محنت سے ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو آزاد ہندوستان کا قانون بن کر تیار ہو گیا اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس کا نفاذ ہوا۔ قانون کے نافذ ہونے کے بعد ملک کے وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوا۔ پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو بنے اور پہلے صدر جمہوریہ کے لئے ڈاکٹر راجندر پرشاد کا انتخاب کیا گیا جو کانگریس پارٹی کے ایک سینئر لیڈر تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ کے عہدے پر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء تک رہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ ہمیشہ آدھی تنخواہ لیتے رہے۔

راجندر پرشاد کی پیدائش ۳ر دسمبر ۱۸۸۴ء کو بہار کے زیرہ دئی نامی گاؤں (چھپرہ) میں ہوئی۔ وہ بچپن سے ہی بہت ذہین تھے۔ ان کے والد مہادیو سہائے فارسی اور سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ اپنے والد سے انہوں نے بچپن میں فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ان کی والدہ کا نام کملیشوری دیوی تھا۔ راجندر پرشاد نے ابتدائی تعلیم چھپرہ ضلع اسکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ پٹنہ چلے گئے اور ٹی۔ کے۔ گھوش اکیڈمی، پٹنہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد بلا کے ذہین تھے۔ ایک بار کی بات ہے کہ انہیں امتحان گاہ میں پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ جب وہ پہنچے تو امتحان شروع ہو چکا تھا۔

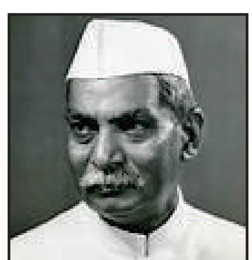

اساتذہ نے انہیں امتحان گاہ میں جانے سے روک دیا اور کہا اب اتنا وقت نہیں ہے کہ تم اپنا پرچہ لکھ سکو گے۔ راجندر پرشاد نے ان سے معذرت طلب کی اور کہا جتنا وقت ہے میں اس میں ہی لکھ لوں گا، مجھے پرچہ دے دیں۔ امتحان ہو گیا، اب آگے کا حال سنو، وہی اساتذہ جب راجندر پرشاد کی کاپی جانچ کر رہے تھے تو آخر میں انہوں نے لکھا: "The examenee is better than examner" (امتحان دینے والا امتحان لینے والے سے زیادہ بہتر ہے۔) ڈاکٹر راجندر پرشاد کا انتقال ۲۸ فروری ۱۹۶۳ء کو پٹنہ میں ہوا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کلکتہ یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد ۱۹۱۵ء میں لا سے ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں وہ گاندھی جی سے ملے اور ان کے ساتھ شریک ہو گئے اور کسانوں کی جدوجہد میں پیش پیش رہے۔ ہندوستانی عوام میں آزادی کا جذبہ جگانے اور انہیں آزادی کا مفہوم بتانے کے مقصد سے انہوں نے ''سرچ لائٹ'' اور ''دیش'' میں مضامین لکھا تا کہ دور دور تک لوگوں کو پیغام پہنچایا جا سکے کہ وہ آگے آئیں اور آزادی کی تحریک سے جڑیں۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد خود بھی بہت سے مقامات پر جاتے اور لکچر دیتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں بہار اور بنگال میں آئے سیلاب کے متاثرین کی مدد کرنے میں بھی انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی سوانح حیات "India Divided" کے نام سے لکھی ہے۔ اس کے علاوہ ''چمپارن تحریک''، ''مہاتما گاندھی اور بہار''، ''باپو کے قدموں میں'' بھی ان کی اہم کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد نوجوانوں میں اپنے دیش کا مستقبل دیکھتے تھے۔ انہوں نے نوجوانوں کو اپنا مستقبل سوچنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی بہت تاکید کی۔ وہ ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ جیتنا چاہتے ہیں تو وقت کے ساتھ چلنا سیکھیں۔ یعنی وقت کی قدر کریں اور وقت رہتے ہوئے ملک و قوم کی خدمت کے لئے آگے آئیں کیوں کہ اس ملک کا مستقبل آپ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ انہوں نے خواب دیکھنے اور اس خواب کو پورا کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کی تلقین کی اور بتایا کہ سب سے بڑی چیز ہے یقین۔ اپنی محنت، اپنی کامیابی پر یقین کریں کیوں کہ یہی یقین کامیابی کے لئے آپ کے جذبے کو زندہ رکھنے میں مددگار ہوتا رہے گا۔ ❁❁

محمد ریحان
Sabzibagh, Patna - 800004

اِس اور اُس

پیارے بچو! ہم ہیں دو دو حرفوں سے بنے بالکل سادہ اور عام سے دو لفظ —— اِس —— اور —— اُس، سادہ اور آسان ایسے کہ کسی کو نہ بولنے میں دقت آئے نہ لکھنے میں۔ نہ حرف پر نقطہ کی ضرورت، نہ حروف کو ملا کر لکھنے کی ضرورت اور عام فہم ایسے کہ کیا اردو والے کیا ہندی والے سبھی بولتے ہی سمجھ جائیں۔ ہم دونوں میں بس فرق ہے تو الف پر زیر اور پیش کا۔ اپنے آپ کو اونچا دکھانا اچھا نہیں ہوتا، اس لئے ہم نے الف پر زبر سے واسطہ ہی نہیں رکھا ہے۔ ہم دونوں ''ضمیر اشارہ'' کے خاندان سے ہیں۔ آدمی کو زندگی میں دور یا نزدیک کی چیز دکھانی ہی پڑتی ہے، اس لئے ہم دونوں ہر وقت ہر شخص کی ضرورت بنے رہتے ہیں۔

اصل میں، ہم میں سے ایک یعنی اِس ''یہ'' کی بدلی ہوئی حالت کا اور دوسرا یعنی اُس ''وہ'' کی بدلی ہوئی حالت کا روپ ہے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ ''یہ'' اشارہ قریب ہے اور ''وہ'' اشارہ بعید۔ اب بات یوں آگے بڑھتی ہے کہ جیسے ہی ''یہ'' کے بعد یا اُس کے ساتھ والے اسم کے بعد پر، تک، سے، کو، کا، کی، کے، میں، نے وغیرہ آتا ہے، ہم میں سے ایک یعنی ''اِس'' اپنا روپ بنا لیتا ہے اور ''یہ'' کو چھپا دیتا ہے۔ جیسے ''یہ نے'' کی جگہ ''اِس نے'' اور بالکل اسی طرح جیسے ہی ''وہ'' یا اُس کے ساتھ والے اسم کے بعد، پر، تک، سے، کو، کا، کی، کے میں، نے وغیرہ آتا ہے، ہم سے دوسرا یعنی ''اُس'' اپنا روپ بنا لیتا ہے اور ''وہ'' کو چھپا دیتا ہے جیسے ''وہ نے'' کی جگہ ''اُس نے''۔ گرامر کی خاص زبان میں ہم دونوں کو اشارہ قریب و بعید یعنی ''یہ'' اور ''وہ'' کی دلی ہوئی ضمیری حالت کہا جاتا ہے۔

آؤ بچو! اب ہم دونوں کے تعلق سے کچھ اور باتیں بھی جان لو۔ بہت سی کہاوتیں اور مقولے ہیں جو ہم دونوں میں سے کسی ایک سے شروع ہوتی ہیں۔ کل ہی دادی ماں کسی کو ڈانٹ رہی تھیں: ''اِس برتے تتا پانی'' یعنی اتنی ذرا سی حیثیت اور اتنا گھمنڈ۔ کبھی کسی بات پر حیرت ظاہر کرنا ہو یا کسی وعدہ خلافی یا نئی شرط کی طرف دھیان دلانا یا کسی ناانصافی کا احساس دلانا ہو تب بھی ''اِس کو کیا کہئے'' اور ''اِس کی نہ سہی نہ بدی'' جیسے فقرے اور محاورے زبان پر آجاتے ہیں۔

ایک اور دلچسپ کہاوت سنو ''اِس سے حاصل کیا کہ شاہجہاں کی داڑھی بڑی تھی یا عالمگیر کی'' مطلب یہ ہے کہ بیکار کی بحث سے کچھ ملنے والا نہیں اور یہ تو آج ہی پڑوس کے آنگن سے صبح صبح سننے کو ملا۔ کوئی آدمی کسی بات پر زور زور سے کہہ رہا تھا ''اِس گھر کا باوا آدم ہی نرالا ہے'' شاید سمجھانا یہی تھا کہ یہاں کبھی کوئی کام اور کوئی بات ڈھنگ سے نہیں ہوتی، آئے دن نیا نیا چلن نکلتا رہتا ہے۔

عزیز بچو! یہ تو نزدیک کے اشارے سے بنے محاورے، کہاوتوں اور فقروں کی مثالیں تھیں، جہاں تک دور کے اشارے یعنی ہم دونوں میں سے ''اُس'' کی بات ہے، وہ زیادہ محاورے اور کہاوتیں نہیں رکھتا، مگر ایک خاص مرتبہ ضرور رکھتا ہے کہ جب زبان پر آتا ہے تو اللہ پاک کی طرف اشارے کرتا ہے جیسے ''اُس کی لاٹھی میں آواز نہیں'' یا ''اُس کے دینے کے ہزاروں ہاتھ ہیں۔'' یعنی اللہ ظالموں سے بدلہ ضرور لیتا ہے اُس سے مایوسی کفر ہے، وہ جہاں سے چاہے، روزی دلاتا ہے۔

پیارے بچو! یہ تو تم سمجھ ہی گئے ہوگے کہ ہم دونوں اپنے اپنے معنی میں ایک دوسرے کی ضد ہیں کیونکہ ہم میں ایک نزدیک کو بتاتا ہے اور دوسرا دُور کو، یا اِس طرح کہہ لو کہ قریب کے مقابلے میں دور یا دور کے مقابلے میں نزدیک، مگر پر لطف بات یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ آکر بھی محاورے بنا دیتے ہیں مثلاً ''اُس نے رکھا اِس نے اُٹھایا'' یہ ہے باپ کی جمع پونجی سے اولاد کا فائدہ اٹھانا یا کڑی محنت کے بعد کسی اور کی ہلکی محنت۔ ایسے محاوروں میں ''اُس''، ''اِس'' سے پہلے کم کم ہی آتا ہے، عام طور پر ''اِس'' سے ہی بات شروعات ہوتی ہے۔ جب آدمی کسی

شجاع الدین شاہد
304, A-Wing, Mansarover Aptt. Malwani Mahada, Malad (W) Mumbai - 400095

لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

چنو ، منو ، رامو ، راجہ — چاروں نے یوں کیا ارادہ
بھاگ چلیں ہم اپنے گھر سے — جنگل بہتر ایسے گھر سے
جب بھی کھیلیں ہم تم کرکٹ — امی ابو کی ہے کٹ کٹ
کہتے ہیں کہ پڑھو پڑھو بس — کیڑے کتابوں کے ہی بنو بس
پڑھتے پڑھتے چشمہ لگے گا — اپنا تو حلیہ بگڑے گا
کلاس میں ٹیچر سے ہے اَن بن — کتنا ہم کو اب ہے ٹینشن
تم ہی بتاؤ ظلم نہیں ہے — ایسا بھی انصاف کہیں ہے
چاروں اک دن گھر سے بھاگے — گھر گھر گھومے ، دَر دَر بھٹکے
پیاس لگی پانی کو ترسے — مانگ نہ پائے خوف و ڈر سے
بھوک لگی جب کچھ نہ پائے — لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

❁❁❁

معاملے سے تنگ آ کر، مجبوراً نتیجے کی پرواہ کئے بغیر کوئی آخری فیصلہ لیتا ہے تو کہتے ہیں ''اِس پار یا اُس پار'' اِسی طرح ''اِس قاف سے اُس قاف تک'' کا مطلب ہے مشرق سے مغرب تک۔

ایک کہاوت اور یاد آئی ''اِس کاندھے چڑھ اُس کاندھے اُتر'' یہ اُس وقت بولتے ہیں جب یہ بتانا ہو کہ جیسا اچھا سمجھو کرلو، ہم کو کوئی عذر نہیں۔ محاورے کی زبان میں ''اِس کان سنیں یا اُس کان'' کا مفہوم یہ ہے کہ اچھی طرح سن لیں، سمجھ لیں اور بہرحال جو کہا جارہا ہے اُس کا پورا خیال رکھیں۔ اِس کے برعکس مفہوم کا بھی ایک محاورہ ہے جو خوب مشہور ہے۔ بڑوں کی نصیحت پر جب بچے دھیان نہیں دیتے تو کہا جاتا ہے: ''اِس کان سے سننا اور اُس کان سے اُڑا دینا'' اس لڑکے کی پرانی عادت ہے۔ اِسی طرح جب کوئی آدمی صرف وقت گزاری کے لئے کچھ کرتے ہوئے دکھائی دے تو ''اِس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں کرنا'' بولا جاتا ہے۔

آدمی جیسا کرتا ہے ویسا ہی پاتا ہے اور ہم دونوں بہت خوش ہیں کہ نظیرؔ اکبرآبادی نے اپنے ایک شعر میں ہم دونوں کو ایک ساتھ لاکر ہمیں خاص عزت دی ہے، تم نے بھی سنا ہی ہوگا اور اسکول میں پڑھا بھی ہوگا ع

کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

ممکن ہے تم ایک بات اور سوچ رہے ہو تو آؤ اُسے بھی بتادیں کہ ''وہ'' اگر واحد غائب کی ضمیر ہو، تب بھی شروع میں بتائے ہوئے طریقہ پر ''اُس'' میں بدل جاتی ہے اور ''وہ نے کھایا'' کی جگہ ''اُس نے کھایا'' ہی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ ''اِس'' اور ''اُس'' یعنی ہم دونوں واحد ہیں اور ہماری جمع ''اِن'' اور ''اُن'' ہے۔ آج کے لئے اتنا ہی، پھر کبھی اور سہی۔

❁❁❁

کائنات ضیا

Mahalper, Biharsharif, Nalanda - 803101

......جب دادی ماں نے سمجھایا

''کان کھاجاتا ہے یار......کان......''

''اس کی زبان میں ہروقت کھجلی ہوتی رہتی ہے۔''

''ارے!اس کے منھ میں پیچش ہے۔''

''چھوڑ یار!وہ بکو ہے......بکو......''

کرکٹ کھیل کے لوٹتے ہوئے راستہ میں جھگڑا ہوتے ہوتے بچا تھا اور اب وہ سب بک بونگ کے بارے میں ایک دوسرے کو سمجھا رہے تھے۔ اس کا اصل نام تو متانت علی تھا،لیکن دوستوں میں وہ اپنی ایک خراب عادت کی وجہ سے بک بونگ مشہور ہوگیا تھا اور وہ خراب عادت تھی، ہروقت، ہرجگہ زور زور سے بس بے تکان،فضول بولتے رہنے، اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہنے اور بے سر پیر کی باتیں کرتے رہنے کی عادت۔اس عادت سے اس کے گھر والے تو پریشان رہتے ہی تھے،اس کے اسکول کے ساتھی بھی تنگ تنگ تھے۔اس کی باتوں پر اکثر لڑائی جھگڑے کی نوبت آجاتی تھی اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔شکایت گھر تک پہنچ گئی تھی اور اب دادی ماں اپنے پوتے اور اس کے بھائی بہنوں کو لئے کمرے میں بیٹھی کچھ سمجھا رہی تھیں۔انہوں نے بہت پیار سے میاں متانت کے کان کی لو چھوتے ہوئے پوچھا:

''تمہارے کتنے کان ہیں۔''

''دو......''

''اور زبان......؟''

''ایک......''

''بالکل ٹھیک!اللہ نے ہمیں دو کان اور ایک زبان دی ہے یہ سبق ہے اس بات کا کہ ہم دو سنیں،تب ایک کہیں۔ہمارے دین میں زبان کی حفاظت کا بار بار سبق دیا گیا ہے۔تم نے امام غزالی کا نام سنا ہوگا۔انہوں نے لکھا ہے کہ زیادہ بولنے والا سب سے بڑا گنہ گار ہے......اور نوزری!تم بھی بہت بولتی ہو۔''

دادی ماں نے اچانک اپنی پوتی کی طرف رخ کیا:''تم کو میں نے فارسی کہاوت بتایا تھا''بسیار گفتن، بسیار خوردن، بسیار خفتن عیب است ''یعنی بہت بولنا،بہت کھانا اور بہت سونا عیب کی بات ہے۔ بہت کھانے والے پیٹو، بہت سونے والے کاہل اور آلسی کہلاتے ہیں۔اسی طرح بہت بولنے والوں کو فضول گو اور باتونی کہا جاتا ہے۔''پھر انہوں نے کونے میں بیٹھے مبشر کو دیکھا:

''مبشر تم تو مدرسہ میں پڑھتے ہو،تم کو ایک عربی قول سناتی ہوں۔'' دادی نے دوسرے پوتے کی طرف دیکھا۔''سنو عربی کا مشہور مقولہ ہے''المکثار مہذار ''زیادہ بولنے والا،بکواس کرنے والا ہوتا ہے۔بسیار گوئی کے لئے''یاوہ گوئی''اور''فہوات'' کے الفاظ بھی ہیں۔ ''یاوہ'' کے معنی نامعقول اور بیہودہ کے ہیں اور''فہوات'' فہو کی جمع ہے جس کے معنی بھولنے کے ہیں۔بیکار کی باتیں کرنے والا آدمی اصل میں کم عقل ہوتا ہے۔حضرت مولا علی نے فرمایا ہے کہ عقل بڑھتی ہے تو باتیں کم ہوجاتی ہیں اور یہ بھی ہم سبھوں نے بار بار سن رکھا ہے کہ جھوٹے کو حافظہ نہیں ہوتا۔زیادہ بولنے والا اپنی دُھن میں بے عقلی کی باتیں کہنے لگتا ہے اور سچ میں جھوٹ بھی ملا لیتا ہے۔وہ جانتا ہی نہیں ہے کہ کم گوئی کے فائدے کتنے ہیں۔'' دادی ماں ذرا دیر کو رکیں، پھر کہنے لگیں:

''خاموشی اور کم گوئی وہ صفت ہے جو ایک فلسفی کے لفظوں میں اُسی طرح ہمارے علم کو تازہ کردیتی ہے جس طرح سو کر اٹھنے کے بعد ہم اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرتے ہیں۔یاد رکھو، خاموشی اور کم گوئی کے پیڑ پر امن کا پھل لگتا ہے اور زیادہ بولنے سے فساد اُٹھتا ہے۔'' دادی ذرا دیر کے لئے پھر رکیں اور کہنے لگیں:

''اچھا اب ایک پیارا سا شعر سنو ے

جب کبھی بولنا وقت پر بولنا
مدتوں سوچنا ، مختصر بولنا

بزرگوں نے بار بار سمجھایا ہے کہ پہلے تو لو تب بولو اس کے لئے کہ بے مطلب کی بات اور بے وقت کی راگنی کبھی کسی کو نہیں بھاتی ہے، جانتے ہو...... بکواس کرنے والے اپنا راز خود دوسروں کو بتا دیتے ہیں۔ ہر وقت جھوٹ، غیبت اور بہتان جیسے گناہ اپنے سر مول لیتے ہیں۔ ہر بات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور ہر وقت ڈینگ اور شیخی بگھارتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس خود اعتمادی اور قوت ارادی کی زبردست کمی ہوا کرتی ہے اور ان کی بکواس سے معلوم نہیں کہاں کہاں کیسی کیسی لڑائی اور غلط فہمی پھیل جاتی ہے۔ پچھلے ہفتہ اُس آنگن کا قضیہ یاد ہے نا......''

''ہاں دادی ماں میں تو جلدی سے بھاگی۔'' نوزری نے کہا:

''بالکل ٹھیک! یاد رکھو زیادہ بولنے سے غلطی بڑھتی ہے، دل سخت ہو جاتا ہے، جسمانی طاقت برباد ہوتی ہے اور عمل کا ارادہ کمزور ہو جاتا ہے۔ زیادہ بولنے کی عادت اصل موضوع یا اصل نکتہ سے آدمی کی توجہ ہٹا دیتی ہے اور سرے سے بے مقصد وقت ضائع ہونے لگتا ہے۔''

پھر دادی نے میاں متانت کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''بیٹا! زیادہ بولنا شیطان کا کام ہے۔ ہمارے کاندھوں پر اعمال لکھنے والے فرشتے ہیں، ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ عادت آدمی کو خود پسندی میں ڈال دیتی ہے۔ اُسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ سامنے والے کی سمع خراشی کر رہا ہے۔''

''خود پسندی اور سمع خراشی کیا دادی اماں......؟''

فرحین نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

''مطلب شومین بننا اور دوسروں کے کان کھانا...... ہاں تو میں سمجھا رہی تھی کہ زیادہ بولنے سے فرشتے ناخوش ہوتے ہیں۔ آدمی کی روح کمزور ہوتی ہے، دماغ پر دباؤ پڑتا ہے۔ غصہ آتا ہے، غصہ بڑھتا ہے۔ میں نے پہلے بھی سمجھایا ہے کہ بسیار گوئی ایسی بری عادت ہے جس سے سماج میں بدگمانی کو ہوا ملتی ہے اور امن و سکون غارت ہو جاتا ہے۔ آدمی کے سوچنے سمجھنے کی ذہنی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے اور گویا وہ بے مطلب کی بات سے خود بھی ناسمجھی کی آفتوں کا شکار ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اُن آفتوں کا شکار بنا ڈالتا ہے......تم اونگھنے لگے......'' دادی نے مبشر کو ٹوکا:

''دھیان دو، سنو! بسیار گوئی کی عادت گھر اور سماج میں آدمی کی عزت اور اس کا اعتبار گھٹا دیتی ہے۔ ایسا شخص کسی کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہوتا کیوں کہ کوئی شخص، کہیں بھی اور کبھی بھی کسی کی بکواس سننا پسند نہیں کرتا۔''

''ہاں! دادی ماں! اُس دن ابو کہہ رہے تھے، گلی میں بات بات میں، لڑکوں کے بیچ ہاتھا پائی ہو گئی تھی۔''

نوروزی نے ایک بار پھر یاد دلایا:

''ہاں! یہ تو ہونا ہی ہے۔ بسیار گوئی تو فتنہ ہے۔ اس سے آدمی مذاق کا نشانہ بنتا ہے اور اس کو بار بار طرح طرح کی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ بہت سے لوگ اپنی چرب زبانی کو لائق تعریف سمجھتے ہیں، لیکن یہ تو ایک ایسا عیب ہے جو اچانک سارا رہا سہا بھرم ختم کر دیتا ہے۔ بار بار پچھتانا، بکواس کرنے والوں کا مقدر ہوتا ہے۔ فضول بولنا آدمی کا دبدبہ ختم کر دیتا ہے۔ اُسے بدزبان، بے باک اور بدتمیز بنا دیتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے ہی نہیں دوسروں کے بھی دشمن ہوتے ہیں۔ وہ خاموشی اور کم گوئی کی طاقت کو برباد کر کے گھریلو اور سماجی معاملات میں بگاڑ لاتے ہیں۔ الفاظ کی غلط تشریح کر کے، غلط تاثر اور غلط پیغام پھیلاتے ہیں جس سے دوسروں کا سکون اور دوسروں کی خوشی برباد ہوتی ہے۔ لوگوں کی دل آزاری بیزاری اور کوفت بڑھتی ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر برا اثر پڑتا ہے۔ نہ جانے کتنی بات اور کتنے معاملے ایسے ہوتے ہیں جو صرف فضول بولنے کی وجہ سے سلجھنے کی بجائے الجھ جاتے ہیں اور نہ جانے کتنی بالکل قریب آتی ہوئی کامیابی اس لعنت بھری عادت کی وجہ سے دور ہو جاتی بلکہ ہمیشہ کے لئے روٹھ جاتی ہے۔ اگر آدمی اپنی زبان پر قابو رکھے، ضرورت کے وقت اور ضرورت کے مطابق ہی بات چیت کرے۔ اس کا لہجہ بھی صاف ستھرا اور میٹھا ہو تو پھر یقیناً وہ کامیاب انسان بن سکتا ہے۔ بکواس کی عادت چھوڑنے میں ہی عزت ہے، عافیت ہے تو پھر آ گے......؟''

دادی ماں نے پہلو بدلا اور تینوں سمجھ گئے اور ایک ساتھ بولے

''اب ہم لوگ خود بھی بچیں گے اور اسکول میں ساتھیوں کو بھی بتائیں گے۔''

''شاباش! جیتے رہو، جیتی رہو۔''

❀❀❀

غزل

وفاؔ براہی

انوار تجلی سے جو معمور ہوئی شمع
مغرور تھی کچھ اور بھی مغرور ہوئی شمع

کچھ خون شفق پی کے جو مخمور ہوئی شمع
ساون کی گھٹا دیکھ کے مسحور ہوئی شمع

کیا تو نے کہا بادِ صبا کان میں جاکر
شرماتی ہوئی ، بزم سے کافور ہوئی شمع

یا بھیڑ تھی پروانوں کی یا سب کا صفایا
مسرور کبھی اور کبھی رنجور ہوئی شمع

تاریکی عالم میں جگہ اپنی بنا کر
اتنی ہوئی پر نور کہ مشہور ہوئی شمع

اس پر بھی اثر تیرا پڑا کیا بت مغرور
شب بھر کی تجلی پہ جو مغرور ہوئی شمع

سمجھا میں وفاؔ محفل ہستی کا مآل آج
جب صبح کو نظروں سے مری دور ہوئی شمع

محمود عالم وفاؔ براہی ابن سید شاہ وصی احمد ضلع پٹنہ کے ایک سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ موضع باسوپنڈہ، براہ (باڑھ) ان کی جائے پیدائش اور ۱۹۱۷ء ان کا سال پیدائش ہے۔ وفاؔ براہی نے علامہ کیفی چریاکوٹی سے عربی کی بعض کتابیں پڑھی تھیں اور ''مدرسہ سبحانیہ'' الہ آباد سے فضیلت کی سند لی تھی۔ وہ حضرت نوحؔ ناروی کے دورسوم کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ وفاؔ براہی کو حکومت برطانیہ نے ازراہِ قدردانی ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے محکمہ نشرواشاعت سے منسلک کرلیا تھا۔ وفاؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''نکہت گل'' موسوم بہ اسم تاریخی ''نکہت فیض'' ہے۔ اس مجموعہ کا تعارف ''تاریخ مگدھ'' کے مصنف فصیح الدین بلخی نے لکھا تھا۔ وفاؔ کا دوسرا مجموعہ ''سحر نظر'' ان کے استاد نوحؔ ناروی کے کلمات تعارف سے شرف یافتہ ہے۔ وفاؔ براہی کے تیسرے مجموعہ ''شرار فطرت'' کا پیش لفظ جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی کے قلم سے ہے۔ یہ تینوں مجموعے پٹنہ سے شائع ہوئے تھے۔ وفاؔ کی شاعری پر لکھنے والوں میں سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ اور فراقؔ گورکھپوری کے نام شامل ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد وفاؔ براہی ڈھاکہ چلے گئے اور وہاں نرائن گنج اسکول میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر عمر میں وفاؔ کا ایک اور شعری مجموعہ سرحد پار سے بھی چھپا تھا۔ وفاؔ براہی کا تذکرہ ''صنم'' بہار نمبر ۱۹۵۹ء، حکیم سید احمد اللہ ندوی کی کتاب ''مسلم شعرائے بہار'' حصہ پنجم اور دیگر کتب و رسائل میں موجود ہے۔ وفاؔ براہی کی رحلت، کراچی پاکستان میں ۵؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو اُس وقت اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے ہوئی، جب وہ وہاں اورنگی ٹاؤن کے ایک مشاعرے میں سقوط ڈھاکہ پر اپنی نظم سنا رہے تھے۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2023

Volume : 44 | December - 2023 | No. 12

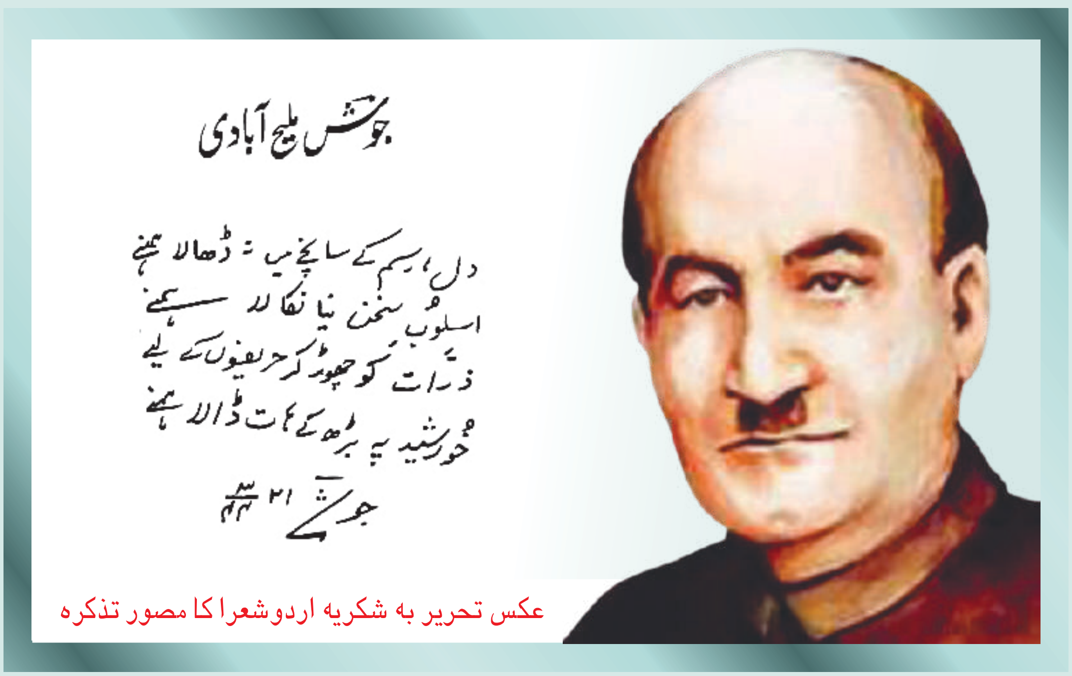

عکس تحریر به شکریه اردوشعرا کا مصور تذکره

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں

طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15